عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوعِ اسلام

جنوری ۱۹۴۱ء

بیادگار حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

دہلی

(دورِ جدید)

مرتب

اخوندزادہ حسین امام

بدل اشتراک
ششماہی
فی پرچہ

پانچ روپیہ سالانہ 5/-
تین روپے 3/-
آٹھ آنے

جلد (۴) شمارہ (۱)

ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

فہرستِ مضامین

سرودِ رفتہ		۱ ـ ۳
لمعات و لطائف	ادارہ	۴ ـ ۱۶
اطاعتِ امیر	از جناب مبصر	۱۷ ـ ۳۹
اشتہار		۴۰
سلیم کے نام چھٹا خط	جناب غلام احمد صاحب پرویز	۴۱ ـ ۵۲
ہندوستان کے مسلمانوں کا جائزہ اور دعوت عمل	جناب مولانا مشتاق احمد صاحب افغان	۵۳ ـ ۶۱
حقائق و عبر	ادارہ	۶۲ ـ ۶۲
نقد و نظر	ادارہ	۶۳ ـ ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سرودِ رفتہ

[حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی طرف سے ذیل کا پیغام نوروز ۱۹۳۸ء کو لاہور کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا تھا۔ جن حضرات کی نگاہیں رفتارِ زمانہ پر ہیں وہ اس "پیغام" سے محسوس کرینگے کہ دنیا اس تین سال کے عرصہ میں جن محیر العقول انقلابات کی آماجگاہ بنی ہے۔ وہ اس مردِ مومن کے آئینۂ ادراک میں کس درخشندگی سے مرتسم تھے۔ یہ وہ فراست ہے جو محض کتاب اللہ کے سراجِ منیر کی ضیا جوئی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ طلوعِ اسلام اس پیغام بصیرت افروز کی اشاعت پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو امتدادِ زمانہ کی دسترس سے بہت بلند ہیں۔ طلوعِ اسلام]

پیغام

دورِ حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے۔ اور یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں۔ اور انسان قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور قوائے فطرت کی تسخیر میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت۔ قومیت۔ اشتراکیت۔ فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اسکی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی، سفاکی اور زبردست آزادی کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں۔ اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح بلند کریں۔ انہوں نے ملوکیت اور

استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک اور پامال کر ڈالا۔ صرف اسلیئے کہ اُنکے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہونچ جائے۔ انہوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد اُنکے اخلاق۔ اُنکے مذہب۔ اُن کی معاشرتی روایات اُنکے ادب اور اُنکے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا۔ پھر اُنکے درمیان تفرقہ انگیزی کرکے اُن بدبختوں کو خونریزی اور برادر کشی میں مصروف کردیا تاکہ غلامی کی افیون سے مدہوش اور غافل رہیں۔ اور استعمار کی جونک چُپ چاپ اُنکا لہو پیتی رہے۔

جو سال گذر چکا ہے اُسکو دیکھو اور آج نو روز کی خوشیوں کے درمیان بھی دُنیا کے واقعات پر نظر ڈالو حبش ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین اس خاکدانِ ارضی کے گوشے گوشے میں یہی قیامت برپا ہے لاکھوں انسان بیدردانہ موت کے گھاٹ اُتارے جارہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کُن آلات سے تمدنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جارہا ہے۔ اور جو حکومتیں فی الحال آگ و خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی میدان میں کمزور دل اور ضعیفوں کے خون کے آخری قطرات تک چوس رہی ہیں۔ غرض ایک ہنگامۂ محشر ہے جس میں نفسی نفسی کے سوا اور کوئی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ تمام دُنیا کے مفکر دم بخود ہیں۔ اور سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہوکر اس کُرّے پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں؟

یاد رکھو! انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دُنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کردیں گی یہ دُنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہیگی کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان۔ ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی عقائد کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلہ کاٹ رہے ہیں۔ اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل۔ زبان۔ رنگ اور قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت۔ اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کردیا جائیگا جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک

جغرافیائی وطن۔ نسل اور رنگ کا امتیاز کاملاً نہ مٹ جائیگا۔ انسان اِس دُنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر نہ کرسکے گا۔ اور اخوت حُریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہونگے۔

آؤ! اِس نئے سال کو اِس دُعا سے شروع کریں۔ کہ خدائے بزرگ و برتر اربابِ حکومت و اقتدار کو انسان بنائے اور اُنہیں انسانیت کی حفاظت کرنا سکھائے۔ آمین!

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟ (اقبالؒ)

(ارمغانِ حجاز)

لمعات

چند دنوں کے بعد ملّت اسلامیہ کا ایک عظیم الشان تیوہار آنے والا ہے جو اُن کی دو بڑی تقاریب میں سے ایک ہے۔ اس تاریخ سے ایک روز پہلے میدان عرفات میں .... وہ عظیم الشان اجتماع ہونے والا ہے جسے چشم فلک دنیا کے کسی اور خطّہ میں نہیں دیکھ سکتی۔ میدان عرفات میں تمام عالم اسلام کے نمائندے شامل ہوں گے اور سب کے سب اپنے مادّی اور حسی اختلافات کو مٹاتے ہوئے اس مقام پر ملّتِ اسلامیہ کے واحد رشتۂ اشتراک میں منسلک ہو کر قلب و زبان کی ہم آہنگی سے کہہ رہے ہوں گے۔

اَللّٰہُ اَکْبَر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ
وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر

خدا بزرگ و برتر ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ بس اسی کے لیے سلطنت ہے۔ اسی کے لئے مدح و ستائش ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے۔

اور اس طرح دنیا میں حکومت خداوندی کے پیمان کی تجدید کرتے ہوئے انسان اور انسان کے درمیان صرف خدائی رشتۂ اتحاد کو وجہ اشتراک بنا رہے ہوں گے۔ اس روز تمام عالم اسلام میں مسرت و شادمانی ہوگی اور ہر جگہ سنتِ ابراہیمیؑ کی یاد میں اس دن کی عظمت کا مظاہرہ کیا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اس اجتماع کی رُوح اور اس تقریب کی رلم کیا ہے؟ اس لئے کہ اسلام محض ہنگاموں اور میلوں کا تو مذہب نہیں۔ اس کے رسوم و ظواہر کی تو اتنی ہی حیثیت ہے جتنی رُوح کے لئے جسم کی۔ اس لئے جہاں ان ظواہر و رسوم کے قیام و بقا کی ضرورت ہے،

وہاں ان کی رُوح کو سامنے رکھنے کی بھی حاجت ہے۔

قرآنِ حکیم نے اُمّتِ مُسلمہ کو اس دنیا میں آمر اور ناہی بننے کے لئے صرف دو جلیل القدر ہستیوں کے اسوۂ کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو اسوۂ خاتم النبیینؐ اور دوسرا اسوۂ حضرت ابراہیمؑ۔ یُوں تو اسلام دنیا میں اس وقت سے موجود ہے جس وقت سے انسانوں کو ہدایت کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن سب سے پہلے جس ہستی نے اسے بطور ضابطۂ حیات کے پیش کیا وہ حضرت ابراہیمؑ کی ہستی تھی۔ اس لئے ملّت اسلامیہ کے لئے جو ملّت ابراہیمیؑ بھی کہلاتی ہے۔ اُسوۂ ابراہیمؑ کا اتباع نہایت ہی ضروری قرار دیا گیا۔ اور انہی کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں اس مقدس تقریب کی رُوح اور لم کا پتہ چل سکتا ہے۔ یُوں تو حضرتِ ابراہیمؑ کی حیاتِ طیبہ کا ہر گوشہ ایسا ہے جو اپنے اندر نمونہ بننے کی تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم رکھتا ہے۔ لیکن اس وقت جو چیز ہمارے پیشِ نظر ہے اس کے لئے اس گہرتا بدار کا صرف ایک درخشندہ پہلو سامنے لانا ہی کافی ہوگا۔

حضرت ابراہیمؑ جس وقت مبعوث ہوئے اس وقت انسانیت مختلف گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ حسب و نسب، لون و لسان اور جغرافیائی حدود و وطن کی بنا پر الگ الگ قومیتیں بنی ہوئی تھیں۔ خود حضرت ابراہیمؑ کی اپنی قوم انہی وجوہِ اشتراک سے ایک قوم بنی ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ نے ان تمام وجوہ اشتراک اور جہات تعاون کو غیر فطری قرار دیتے ہوئے انسان اور انسان کے درمیان صرف ایک ہی رشتۂ اتحاد قرار دیا۔ جو اتحادِ عقیدہ و یقین یعنی ایمان کی وجہ سے قائم ہو سکتا تھا۔ اُنھوں نے انسانیت کی تقسیم اس بنا پر کی کہ کسی دوسری قوم اور اُن میں کوئی قدرِ مشترک نہیں۔ رنگ۔ نسل۔ زبان جغرافیائی حدود۔ وطن اور سیاسی اشتراک کے تعلقات کی موجودگی میں بھی یہ ملتیں متحد نہیں ہو سکتیں۔ اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کو، اپنے تمام قبیلے کو اور ساری قوم کو "غیر ملت" کے اجزا شمار کرتے ہوئے ان سے اپنی برأت کا اعلان کیا۔ اور اپنی ملت میں صرف اُن لوگوں کو شامل کیا جو صرف عقیدۂ توحید کو ہی انسانیت

کے لئے وجہ اشتراک مانتے تھے۔ چنانچہ اس اساس پر جو ملت قائم ہوئی اسکے افراد نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ ملت کافرہ کے ساتھ کسی صورت میں بھی اشتراک نہیں کر سکتے۔ جب ان کی ملت کی اساس ہی کفر پر ہے تو وہ اسلامی ماحول کی تعمیر کو کس طرح برداشت کریں گے۔ لہٰذا ملت اسلامیہ اور ملت کافرہ میں اتحاد و موافقت اس وقت تک ناممکن رہیگا۔ جب تک کہ ملت کافرہ خدا کی حاکمیت پر ایمان نہیں لے آتی اور ملت اسلامیہ کے عقیدہ و یقین کو تسلیم نہیں کر لیتی۔ قرآن حکیم نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کے متبعین کے اس اسوۂ حسنہ کو ہمارے لئے واجب الاتباع قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (الممتحنہ)

"تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں میں یہ قابلِ تقلید نمونہ ہے کہ انھوں نے اپنی (وطنی اور نسلی) قوم سے صاف کہدیا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کرتے ہو کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور دشمنی ہو گئی۔ تاوقتیکہ تم ایک خدا پر ایمان لاؤ۔"

حضرت ابراہیمؑ صحیح معنوں میں حنیف تھے۔ اُنھوں نے دُنیا کے تمام اُصولوں کو بمقابلۂ اسلام کے مردود قرار دے کر ٹھکرا دیا۔ حتّٰکہ اپنے باپ (یا چچا) تک کو بھی کہدیا کہ میرا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں تاوقتیکہ تم بھی میری طرح ساری دنیا سے کٹ کر ایک خدا کی چوکھٹ پر سر نہ جھکا دو۔ وہ تمام کفار کے مقابلہ میں بجائے خود اُمت مسلمہ تھے۔ اُن کی ذاتِ اقدس اُمت کے لئے

نقطۂ پرکار تھی۔ قرآن حکیم نے اُن کی اس حیثیت کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۝ (النحل)

تحقیق ابراہیمؑ خدا کے سامنے فرمانبردار اُمّت اور حنیف تھے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے دُنیا بھر کے انسانوں کو یہی پیغام ابدی دیا کہ تمام غیر فطری امتیازاتِ نسل۔ رنگ۔ زبان اور وطنیت کو توڑ دو۔ اور صرف عقیدۂ توحید کو ہی وجۂ اشتراک بناؤ۔ چنانچہ عرفات کے میدان میں حضرت ابراہیمؑ کی اسی سنّت طیبہ کی اتباع میں اسی رنگ کا اجتماع ہوا اور آج تک ملّت اسلامیہ کے لئے ارکان دین میں سے ایک اہم رُکن کی صورت میں ہر سال عالم اسلام کے نمائندے اس مبارک یاد کو تازہ کرتے ہیں اور تمام دنیائے اسلام میں یک رنگی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ عظیم الشان تیوہار منایا جاتا ہے۔

عرفات کے میدان میں جو اجتماع ہو رہا ہے وہ اسی وجۂ اشتراک کا عملی مظاہرہ ہے جس کی ابتدا حضرت ابراہیمؑ نے کی اور جس کی دعوت تمام انبیاء کرام دیتے آئے۔ اور جس کی تکمیل نبیٔ اکرمؐ نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے کر دی۔ اس کی تقلید میں آج بھی یہ حالت ہے کہ دُنیا کے مختلف خطوں اور دُور دراز گوشوں میں بسنے والے توحید پرست۔ رنگ۔ نسل۔ وطن وغیرہ کے تمام غیر فطری حدود و قیود کو توڑ کر ایک میدان میں جمع ہوتے ہیں تاکہ دنیا کو بتا دیا جائے کہ ؎

بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے۔

لیکن افسوس کہ عرفات کے میدان میں جمع ہونے والوں کی نگاہیں بالعموم ایک رسم کی ادائیگی کی حد تک جا کر رُک گئیں۔ اور اُنھوں نے طواف حرم سعی بین الصفا والمروہ وغیرہ ارکان کی تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت سامنے نہ رکھی کہ "اُمّت حنیفہ" بننے کے لئے کس طرح ساری دُنیا سے کٹ کر ایک مرکز سے پیوست ہو جانے کی ضرورت ہے۔

(۲)

اسے حسنِ اتفاق کہیئے یا ملّتِ اسلامیہ کی خوش بختی کہ عین اس وقت جبکہ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کی ناگہانی وفات سے چشمِ ملّت سیاسی بصیرت سے محروم ہو رہی تھی اور کسی طرف کوئی راستہ دکھانے والا نظر نہ آتا تھا۔ مبداءِ فیض کی کرم گستری نے انہی "دیرنشینوں" میں سے ایک مردِ دانا کو رُو بہ قبلہ کر دیا اور وہی مسٹر جناح جو اس سے پیشتر مخلوط انتخاب تک کے حامی ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد پاکستانی اسکیم کے علمبردار بن گئے۔ بایں ہمہ وہ لوگ جن کی نگاہیں قلبی انقلاب سے زیادہ سیاسی تغیّرات پر ہوتی ہیں۔ وہ یہی سمجھتے چلے آرہے تھے کہ مسٹر جناح کے نزدیک پاکستانی اسکیم "شیشہ گرانِ فرنگ" کے عددی تارِ عنکبوت اور اکثریت اور اقلیت کے اُتار چڑھاؤ سے زیادہ کچھ نہیں۔ حتٰی کہ بعض لال بجھکڑ قسم کے خود فریب لوگ ایسے بھی تھے جو اسے ایک سیاسی گیدڑ بھبکی (political Stunt) ہی قرار دیتے تھے۔ لیکن وہ باریک بیں حضرات جو مسٹر جناح کے قائم کردہ نشاناتِ راہ کا بغائر مطالعہ کرتے تھے اُنہیں خوب معلوم تھا کہ کاروانِ ملت کا یہ قائدِ اعظم انہیں کس منزل کی طرف لئے جا رہا ہے۔ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔ مغربی اندازِ جمہوریت ناقابلِ قبول ہے۔ اس قوم کو ایک الگ گھر کی ضرورت ہے۔ یہ گھر سردست مسلم اکثریت کے علاقوں میں بآسانی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ نشانِ راہ تھے جو اربابِ بصیرت کو صاف صاف بتا رہے تھے کہ مسٹر جناح کس طرح حکیم الامت مرحوم کے تصوّرات کی دُنیا کو مطمحِ نگاہ بنا چکے ہیں۔ اس پر بھی سطح بیں حضرات یہی سمجھتے تھے کہ مسٹر جناح کے پیشِ نظر شمال مغربی اور شمال مشرقی صوبوں کی تقسیمِ جدید سے آگے اور کچھ نہیں۔ لیکن یہ مردِ راہ داں اب ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اور اس نے ۲۴ دسمبر کو ہلالِ یمن جمعیت (کراچی) کے ایک سپاسنامہ کے جواب میں فرمایا:-

"تم شمالی ہندوستان سے سندھ کی طرف آئے اور سندھ سے کچھ دُور کاٹھیاواڑ کی طرف پھیل گئے۔ تمہاری برادری کے بہت سے افراد دُنیا کے دُور دراز گوشوں تک جا پہنچے ہیں

میں اب سفارش کرتا ہوں کہ تم پھر اپنے گھر کی طرف لوٹ
آؤ - تمہارے لئے سندھ - بلوچستان - پنجاب اور صوبہ سرحد
میں پھولنے پھلنے کے بڑے وسیع امکانات موجود ہیں"

(ہندوستان ٹائمز 26 12/40)

ان الفاظ پر ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ غور کیجئے - بار بار غور کیجئے کہ یہ الفاظ نہیں بلکہ وہ نقوش قدم ہیں جو راہ روانِ منزلِ شوق کو ایک جہانِ نوکا نشان دکھا رہے ہیں - اس کے بعد بھی جو مسٹر جناح کی منزلِ مقصود کو نہیں پہچانتا - سوائے اس کے کہ اس کی کور چشمی کا ماتم کیا جائے اور کیا ہو سکتا ہے -

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ مسٹر جناح کہاں تک جا پہنچے ہیں - اور خود پنجاب کے " ذمہ دار حلقوں " میں اس اسکیم کی مخالفت ہو رہی ہے - چنانچہ جناب سر سکندر حیات خاں کے دستِ راست سر چھوٹو رام صاحب پنجاب کے میں قریہ بہ قریہ - شہر بہ شہر کوچہ بہ کوچہ پاکستان کے خلاف زہر افشانی کئے چلے جا رہے ہیں - عین ۲۴ دسمبر کو جس وقت مسٹر جناح میمن برادری سے " اپنے گھر " کو واپس آنے کی تلقین فرما رہے تھے - سر سکندر کے یہ معتمد علیہ موضع کھٹھ (ضلع فیروز پور) میں اس اسکیم کا مضحکہ اڑا رہے تھے - (اسٹیٹسمین ۲۵ دسمبر)

لیکن سر چھوٹو رام صاحب کی روش سے کہیں زیادہ پُر لطف مسلک پنجاب کے اُن " اسلامی " اخبارات کا ہے جو یونینسٹ پارٹی کے نفس ناطقہ بنے ہوئے ہیں - اُن کی حالت یہ ہے کہ یہ مہاشے کرشن اور خورشید - بھائی پرمانند اور سردار تارا سنگھ کے خلاف بڑا جوش خروش دکھائیں گے کہ یہ لوگ پاکستان کی مخالفت کیوں کرتے ہیں - لیکن قسم لے لو جو کبھی سر چھوٹو رام وشر کا ہُم کی اس قسم کی زہر افشانی کے خلاف ایک لفظ بھی لکھیں - حالانکہ دس ملاپ اور پرتاپ بھی کھڑے ہو جائیں تو وہ اثر نہیں پیدا کر سکتے جو حکومت کا ایک وزیر کر سکتا ہے -

بایں ہمہ پنجاب کے ان تمام دوست نما دشمنوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ پاکستان ایک حقیقت ہے جو واقعہ ہو کر رہیگی۔ خواہ جاہ پرست "اپنوں" اور کینہ پرور بیگانوں کی طرف سے اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہو۔ مسٹر جناح بتوفیق ایزدی اب ان "جادوگروں کی رسیوں" سے ڈرنے والے نہیں۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اکثر
مجھے کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

یہ سطور لکھی جا چکی تھیں کہ ۲۹ دسمبر کے ہندوستان ٹائمز میں مسٹر جناح کی اس تقریر کے اقتباسات نظر سے گذرے، جو انھوں نے احمد آباد کے ایک جلسۂ عام میں کی۔ اس تقریر میں آپ نے فرمایا:-

"پاکستان (کوئی نئی چیز نہیں بلکہ یہ تو) صدیوں سے موجود ہے مسلمانوں کا شمال مغربی اور شمال مشرقی حقیقی ملک ہے۔ جہاں آج بھی ان کی آبادی ننانوے فیصدی سے زائد ہے۔ ان علاقوں میں ایسی آزاد اسلامی حکومت قائم ہونی چاہیئے جس میں مسلمان اپنے مذہب۔ اپنے کلچر اور اپنے قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں"

اس تقریر میں آپ نے اقلیت کے صوبہ والوں کو مخاطب کر کے فرمایا:-

"ہم اقلیت کے صوبہ والوں پر جو گذرتی ہے۔ گذر جانے دو۔ لیکن آؤ ہم اپنے بھائیوں کو تو آزاد کرا دیں جو اکثریت کے صوبوں میں ہیں۔ تاکہ وہ شریعت اسلامی کے مطابق وہاں آزاد حکومت قائم کر سکیں"

——— پاکستان سے مفہوم کیا ہے؟ مسٹر جناح کیا چاہتے ہیں؟ اس باب میں اُن کا عقیدہ کس قدر محکم اور نگاہ کتنی صاف ہے؟ اگر مصرحہ بالا تقریر کے بعد بھی کسی کو ان اُمور میں شبہ باقی

رہتا ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ کرسمس کی تعطیلات میں طول و عرض ہند میں مختلف مقامات پر ہندوؤں اور سکھوں کی متعدد کانفرنسوں کے اجلاس ہوئے۔ اُن میں سے ہر ایک میں پاکستان کے خلاف ریزولیشن پاس کئے گئے۔ اس ہجوم مخالفت میں اس بیباکی اور بلند آہنگی سے ایسا صاف اور واضح اعلان اسی مردِ حق بیں و حق گو کی طرف سے ہو سکتا تھا۔

زندہ باد محمد علی جناح　　پائندہ باد پاکستان

لیکن اب سوال یہ ہے کہ نصبُ العین کے اس قدر صاف۔ واضح اور غیر مبہم طور پر سامنے آجانے کے بعد قوم پر جو اہم فریضہ عائد ہو جاتا ہے قوم کو اس کی ادائیگی کی کس قدر فکر ہے۔

شریعتِ اسلامی کے مطابق آزاد اسلامی حکومت کا قیام"!

ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون سا بدبخت "مسلمان" ہے جو اس نصب العین کی مخالفت کریگا؟ ہم پوچھتے ہیں تحفظِ دینِ متین کے مدعیان۔ یعنی قومیت پرست حضرات علمائے کبار سے کہ کیا انہیں قرآن یہی سکھاتا ہے کہ اس نصب العین کو چھوڑ کر ہندو راج۔ یا زیادہ سے زیادہ "کفر و اسلام کی مخلوط قومی حکومت" کے قیام میں کوشاں ہوں۔ وہ بتائیں تو سہی کہ اس نصب العین کے بعد وہ کون سی چیز باقی ہے جو انہیں گاندھی جی کی "روحِ عظیم" کے سامنے جبیں سائی پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم بھی تو سُنیں کہ اسکے بعد وہ اور کیا چاہتے ہیں!

فبای حدیث بعدہ یومنون

مسلمانو! سُن رکھو کہ جس قسم کے انقلابی دور سے دُنیا آج گذر رہی ہے اسمیں جو پیچھے رہ گیا۔ مٹ جائیگا۔ باقی وہ رہیگا جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ زندہ وہ رہیگا جس میں زندہ رہنے کی تڑپ ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردار جس کا وہ رازِ رب آشکار ہوگا
نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مُدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

خاکساروں کے بڑے مقدمہ کا فیصلہ سُنا دیا گیا اور ۱۹ ملزمین کو مختلف سزائیں دی گئیں جو عبور دریائے شور تک منتہی ہیں ۔

حکومت اور خاکساروں کے تصادم کے ناشدنی واقعہ کے متعلق اس سے پیشتر کئی مرتبہ طلوع اسلام کے صفحات پر ذکر آچکا ہے ۔ آخری مرتبہ جب حکومت پنجاب نے جماعت خاکساران پر عاید کردہ پابندیاں اُٹھالی تھیں ۔ ہم نے گذارش کی تھی کہ ملک میں امن و آشتی کی فضا کو سازگار بنانے کے لئے قرین مصلحت یہی ہے کہ حکومت اس مقدمہ کو بھی واپس لے لے جو خاکساروں کے خلاف چلایا جا رہا ہے ۔ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ صلح کی صورت میں "جنگ کے قیدیوں" کو بلا شروط رہا کر دیا جاتا ہے کہ صلح کے پیمان و عہود میں استحکام کی یہی شکل ہوا کرتی ہے ۔ اس سے فریقین کے مجروح دلوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں ۔ تلخ واقعات کی یادگار مٹ جاتی ہے ۔ اور آئندہ کے لئے خوشگوار تعلقات کے لئے فضا مساعد ہو جاتی ہے ۔ لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکومت نے ہمارے اس مخلصانہ مشورہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور اس مقدمہ کے فیصلہ سے مٹتے ہوئے نقوش کی دلگداز یاد پھر سے تازہ کر دی ۔

ذرا تھوڑے وقت کے لئے اسے بھلا دیجئے کہ یہ تصادم "حکومت" اور "رعایا" کے درمیان ہوا تھا ۔ اس کے بعد یہی حقیقت رہ جائیگی کہ "انسانوں" کی دو جماعتوں کے درمیان باہمی تنازع نے تصادم کی شکل اختیار کر لی ۔ جس میں فریقین زخمی بھی ہوئے اور مقتول بھی اب ظاہر ہے کہ جب دو تو انسان ہی تھے تو غلط روی کا امکان دونوں طرف سے ہے ۔ لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ ان میں سے ایک فریق کو حوالۂ قید و بند کر کے اُن پر مقدمہ دائر کیا گیا جس کے فیصلہ پر ان میں ۱۹ نفوس کو حبس دوام تک کی سزا دی گئی ۔ لیکن فریق ثانی پر نہ کہیں مقدمہ چلا ۔ نہ انہیں کسی پاداش کا سزاوار قرار دیا گیا ۔ ان کے متعلق البتہ ایک ۔

تحقیقاتی کمیٹی ضرور بٹھائی گئی۔ لیکن وہ کمیٹی کس نتیجہ پر پہنچی اس کا علم آجتک کسی کو نہ ہو سکا۔ اگر ہمیں جرأت ہو تو سے معاف کیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ ہر انصاف پسند انسان اسی نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوگا کہ اس باب میں جو کچھ کیا گیا "احترام آدمیت" کو ملحوظ رکھ کر نہیں کیا گیا۔ بلکہ "حاکم" اور "محکوم" کے اس فرق کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا جو اس دور تمدن میں (جبکہ ہر طرف مساوات۔ معدلت اور جمہوریت کے بلند آہنگ دعاوی فضا میں گونج رہے ہیں) دورِ استبداد کی یاد کے سوا اور کچھ نہ سمجھا جائے گا۔

ہم عدالت کے اس فیصلے پر کوئی تنقید نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ارباب حکومت سے ایک مرتبہ پھر گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ اب بھی وہ اپنی روش پر نظر ثانی ڈالیں اور اس مقدمہ کو واپس لے لیں تاکہ ماضی کے ان تلخ واقعات کی یاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو ہو جائے۔ جو "راعی" اور "رعایا" دونو کے حق میں بہتر ہوگا۔

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم زرازے
کہ جہاں تواں گرفتن بنوائے دل نوازے

---

(۴)

کسی سابقہ اشاعت میں لکھا گیا تھا کہ ریڈیو کے اسلامی پروگرام کی اصلاح کے متعلق ہم محکمہ ریڈیو کے ارباب بست و کشاد سے خط و کتابت کر رہے ہیں اور وعدہ کیا تھا کہ اس کے نتائج سے قارئین طلوع اسلام کو مطلع کیا جائے گا۔ ہماری پہلی چٹھی کا جواب محکمہ کی طرف سے موصول ہو گیا ہے۔ لیکن چونکہ ابھی مسئلہ زیر بحث کسی فیصلہ کے مقام تک نہیں پہنچا۔ اس لئے محکمہ مذکور کو اور چٹھی لکھی گئی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ اشاعت تک ہم اس خط و کتابت کو شائع کر دینے کے قابل ہو سکیں گے۔ اس وقت آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ اس باب میں ہمارے پیشِ نظر کیا ہے۔ اس وقت اس ضمن میں صرف اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ گذشتہ لیلۃ القدر اور عید الفطر کی تقریب پر جناب علامہ سلم صاحب جیراجپوری اور چودھری غلام احمد صاحب

پرویز نے جو تقاریر نشر کی تھیں اور جنہیں طلوع اسلام میں شائع کیا گیا تھا۔ ملک میں اُنہیں بیحد پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور قارئین طلوع اسلام کی طرف سے جو اطلاعات ہم تک پہنچی ہیں اُن سے معلوم ہوا کہ ایسی تقاریر کو جاری رکھنے کے لئے مختلف اطراف واکناف سے تقاضا ہوا ہے۔

ہمیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ محکمۂ ریڈیو نے عید اضحیٰ کی تقریب پر پھر ان دونو حضرات کو تقاریر نشر کرنے کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ جناب پرویز صاحب ۹ر جنوری کی شام (دس بجے) "قربانی کے احکام از روئے قرآن" اور جناب علامہ اسلم صاحب اُسی شام (۸ بجے) "عید اضحیٰ کیوں منائی جاتی ہے" کے عنوان پر تقریر نشر فرمائیں گے۔ جی چاہتا تھا کہ ان تقاریر کو اشاعتِ زیرِ نظر میں شائع کر دیا جائے۔ لیکن رسالہ میں اس قدر تاخیر مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ جہاں جہاں ممکن ہو آپ ان تقاریر کو سنئے اور اس کے بعد اپنی آرا سے اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو دہلی کو مطلع فرمائیے کیونکہ رائے عامہ معلوم ہو جانے سے محکمہ ریڈیو اپنے پروگرام کے متعلق کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

گذشتہ اشاعت حضرت اسد ملتانی کے کلام سے محروم رہی۔ اور اشاعت زیرِ نظر میں بھی نگہ جستجو اس باب میں ناکام رہے گی۔ جناب اسد کو طلوع اسلام کے ساتھ جو خصوصی تعلق ہے (اور جسپر ہمیں بجا طور پر ناز ہے) اسکے پیشِ نظر ہمیں یقین ہے کہ بزمِ طلوع اسلام میں ان کی غیر متوقع عدم شرکت کے متعلق استفسارات ہوں گے۔ اسلیئے قارئینِ طلوع اسلام کی اطلاع کے لیے بصد رنج واندوہ لکھا جاتا ہے کہ وسط نومبر میں جناب اسد کا بڑا لڑکا (امجد مرحوم) بہ عمر قریب ۶½ برس۔ اچانک رحلت ہو گیا۔ اولاد کا صدمہ یوں بھی جگر شق کر دیتا ہے لیکن مبدا فطرت نے اس ننھے بچے کو دل و دماغ کی جن نادر خصوصیتوں سے نوازا تھا۔ ان کے پیشِ نظر جناب اسد کے لیے پیارے امجد کی موت۔ محض ایک بیٹے کی جدائی ہی نہیں۔ بلکہ مستقبل کی شاداب اُمیدوں کی پامالی بھی ہے۔ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالےٰ جناب اسد کو اس صدمۂ جانکاہ کے برداشت کی توفیق عطا فرمائے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

لطائف

۱- فرانس (جولائی ۱۹۴۰ء)

طلسمِ نغمہ و رقص و شراب ٹوٹ گیا
پیالہ پھوٹ گیا اور رباب ٹوٹ گیا

خطوطِ شیب عیاں ہو گئے نگاہوں میں
نگارِ عزب کا بندِ نقاب ٹوٹ گیا

جو دُور تھے، تو دکھاتی تھی چشمہ تشنہ لبی
قریب آئے تو نقشِ سراب ٹوٹ گیا

بشر کو کھا گئی حوّا نئے زمانے کی
فسونِ مور سے بالِ عقاب ٹوٹ گیا

۲- عورت کا راز

تقلیدِ اہلِ عزب سے منزل نہ مل سکی
دنیا میں راہ اپنے لئے خود تلاش کر

تہذیبِ نو کا بادۂ رنگین انڈیل دے
جام و سبوئے خام کو اب پاش پاش کر

عورت ہے ایک راز تو تُو ہے امین راز
مغرب کی طرح بزم میں اسکو نہ فاش کر

۳- ہنروری

مصوّری ہو کہ رقص و سرود و شعر و سخن — نہ عشق ہو تو ہیں کیا سحرِ ساحری کے سوا

ہُنر کی آگ میں اُچھلے جو دل نہ مثلِ سپند — تو کچھ نہیں ہے وہ تشہیرِ کافری کے سوا

غلام قوم عمل سے نفور، محوِ سخن! — ہیں زندہ قوم کو سو کام شاعری کے سوا

نہ جس کے دل میں ہو پرتوِ لا الٰہ کا نور — تو اس سے ہو نہ سکیگا کچھ آذری کے سوا

تجھے بتاؤں میں، الہام ہے فنون کی رُوح
ہنروری بھی نہیں ہے پیمبری کے سوا

۴- ضبطِ تولید

ہے نئی تہذیب میں بھی جاہلیت کا اثر — نوجوانوں کا گناہوں کی طرف ہے ربطِ نفس

آدمیّت کی نظر سے دیکھکر فرمائیے! — ضبطِ تولید آپ کو مطلوب ہے یا "ضبطِ نفس"

سید نعیم صدیقی
(ندوہ علمیہ ملیہ)

اطاعتِ امیر

(گذشتہ سے پیوستہ)

باب سوم

جناب "مبصر"

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است
ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کار بے نظام او چہ گویم؟
تو می دانی کہ ملت بے امام است!! (اقبالؒ)

(اس مضمون کی دو قسطیں اس سے پیشتر شائع ہو چکی ہیں۔ افسوس ہے کہ صاحب مضمون کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے یہ قسط دیر سے شائع ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ مضمون کا ہر باب فی ذاتہٖ مکمل ہے اس لئے اس تاخیر سے مضمون کی مجموعی حیثیت پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا۔ اس کی ایک قسط ابھی اور باقی ہے جس میں یہ بتایا جائے گا کہ ہندوستان میں بحالات موجودہ اطاعت امیر کی گم شدہ کڑی کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ طلوع اسلام)

گزشتہ اشاعت میں بحث یہاں آکر ختم ہوئی تھی کہ اسلام جس جماعت کے پیدا کرنے اور زندہ رکھنے کے درپے ہے اُس کا دار و مدار **اعتصام بحبل اللہ** پر ہے۔ پھر عرض کیا گیا تھا کہ اس اجمال کی تفصیل اُن اوامر و نواہی کی پابندی ہے جن پر قرآن کریم مشتمل ہے اور اسکا مختصر سا گُر (Formula) ہے یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ (ترجمہ) "اے ایمان والو! اطاعت

کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اس صاحب امر کی جو تم میں سے یعنی ایمان لانے والوں میں سے ہو۔"

اطاعت امیر ان توضیحات سے یہ شے تو واضح ہوگئی کہ جماعت کے قیام و بقا کے لئے اعتصام بحبل اللہ ضروری ہے اور یہ اعتصام اُن اوامر و نواھی کی اجتماعی پابندی ہے جن سے اسلام کا ضابطہ متشکل ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ اس پابندی کی عملی شکل ہے کیا جن اللہ کی رسی سے اعتصام کی شدید تاکید کی جارہی ہے اور جس میں انسانیت کی اجتماعی حیات کا راز ہے اس کو کس طرح مضبوطی سے پکڑا جاسکتا ہے؟ خدا کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ سن نہیں سکتے۔ محسوس نہیں کرسکتے۔ اسکی ذات ہماری خبر و نظر کی حیطون سے آزاد اور ورا الوریٰ ہے۔ تو پھر ایسی ان دیکھی اور ان بوجھی "ہستی" کی اطاعت یعنی چہ؟ یہاں وجود باری تعالیٰ کی بحث اصل موضوع سے دور جا پڑتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی لئے خطاب صرف اُنہی لوگوں سے کیا ہے جو ہر قسم کے ریب و تردد سے پاک اور بلند ہو کر علی وجہ البصیرت اُس ذات یکتا و بے ہمتا پر ایمان لا چکے ہیں یہ تخصیص تخاطب محض اس لئے ہے کہ جو جماعت پیدا کرنی مقصود ہے اس کا قصر رفیع اُنہی قلوب کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوسکتا ہے جن کا ایمان حق الیقین اور عین الیقین کے درجہ تک پختہ ہوچکا ہے۔ اہل ایمان کی اس جماعت کو کہا جارہا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرے اور وہ اس طرح کہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی اطاعت کرے۔ انسانیت کی نمود سے لے کر آخر تک انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اس لئے ہی آتے رہے کہ انسانوں سے خدا کی اطاعت کرا سکیں۔ انسانوں کی طرف سے انسانوں ہی کو اس لئے رسول بنا کر بھیجا جاتا رہا ہے کہ غیر محسوس اور غیر مشہود خدا کی اطاعت نہ کرنے کے لئے کوئی عذر اور کوئی حیلہ باقی نہ رہے۔ چونکہ رسول منصب رسالت کی جہت سے جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ بلکہ عین منشائے الٰہی اور وحی خدا ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کی اطاعت کی شکل اس کے بھیجے ہوئے رسول کی اطاعت قرار پاتی ہے۔ رسول کی اطاعت سے انکار خدا کی خدائی سے بغاوت ہے۔ رسول آتا ہی اس لئے ہے کہ اُس کی اطاعت کی جائے۔ ما ارسلنا من رسولٍ الا لیُطاع باذن اللہ ؕ ترجمہ "ہمنے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس مقصد کے ساتھ کہ اُسکی

اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے "۔

انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے انسانوں کو رسول بنا کر بھیجنے کو اللہ نے ایک بہت بڑا احسان اور انعام قرار دیا ہے۔ ذرا غور فرمائیے اگر ہماری ہدایت کے لئے کوئی جن یا فرشتہ تجویز کر دیا جاتا تو اللہ اس پر بھی قادر تھا۔ ان اللہ علیٰ کل شیئٍ قدیرٌ مگر وہ تو لوگوں کے لئے شفیق اور مہربان ہے ان اللہ بالناس لرءوف الرحیم ہ انسانوں ہی میں بعض برگزیدہ ہستیوں کو رسول بنا کر اور پھر ان ہی میں سے خاتم النبیین اور صاحب لولاک نبیؐ کو اُٹھا کر اس نے :۔

(۱) انسانیت کے مرتبہ کو بلند سے بلند تر کر دیا۔ (۲) اپنے رسولوں کو اپنے بھیجے ہوئے ضابطہ کا مکمل اور احسن ترین نمونہ بنا کر دوسروں کے لئے اس ضابطہ کی پابندی آسان کر دی (۳) اس سارے انعام و اکرام سے تمتع اندوز ہو کر انسان کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ ایک محسوس۔ مشہود اور ناطق پیکر کی مثال سامنے رکھ کر نیابت الٰہی کے اس پروگرام پر عمل پیرا ہو سکے جس کے صلے میں وہ فرشتوں سے بھی بلند مرتبت ہے۔

ان ساری حقیقتوں کو یوں بیان کیا گیا :۔ لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسہم یتلوا علیھم آیاتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ـــــ الخ "یقیناً اللہ نے مومنوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ اُن کے لئے انھیں میں سے اپنا رسول پیدا کیا جو ان کو اس کی نشانیاں بتلاتا ہے۔ ان کی تہذیب نفس اور تطہیر کرتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے"۔

غرضیکہ آغاز کار سے اللہ نے اپنی اطاعت کی شکل یہی رکھی ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی اطاعت کی جائے۔ مگر باوجود اس شرف و اختصاص کے جو تمام رسولوں سے بڑھ کر نبی کریمؐ کو حاصل تھا اور جس تک مخلوقات میں سے کسی کی رسائی نہ ہوئی ہے نہ ہو گی جملہ انبیائے کرامؑ اور آنحضورؐ موت وحیات کے اُسی قانون کے پابند تھے جو عام انسانوں کے لئے ہے۔ اور وہ قانون ہے کُلّ نفسٍ ذائقۃ الموت ۔ یا۔ کلّ من علیھا فانٍ ہے۔ چنانچہ سرور کائناتؐ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے :۔

ما محمد الا رسول۔ لقد خلت من قبلہ الرسُلؐ افائن مات او قتل انقلبتم علےٰ اعقابکمؐ ومن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاًہ یہ آیت اگرچہ غزوۂ اُحد کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔ مگر

اس کی شانِ نزول سے قطع نظر اس میں ایک اٹل اور ابدی حقیقت ہے جس کی طرف توجہ دلانا مقصود اصلی ہے۔ اس کو کما حقہٗ سمجھ لینے سے یہ چیز ذہن میں آجائے گی کہ اللہ کی اطاعت تو ایک محسوس مشہود اور ناطق پیکر یعنی رسول کی بالمشافہ اطاعت سے اس کی زندگی میں ہوگئی۔ مگر رسول کے بعد اللہ کی اطاعت کی کیا صورت ہے اور خود رسول کی اطاعت جو خدا کی اطاعت کا دوسرا نام ہے کیونکر ممکن ہے۔ آیت زیرِ غور میں مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ "محمدؐ تو صرف اللہ کا رسول ہے۔ یقین جانو کہ اُسؐ سے پیشتر بھی رسول آئے اور تشریف لے گئے۔ (اسی طرح وہ بھی) انتقال فرما جائیں یا (فرض کرو) قتل کردیے جائیں تو کیا تم (اپنی کفر کی حالت کی طرف) مڑ جاؤ گے"؟ اُحد کے جاں نثاروں نے اس کا جواب نفی میں دیا تھا۔ لیکن یہ سوال پوچھنے والا خدا ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے کہ رسول کے پیکر کی پرستش کرنے والے اگر اس کے بعد مڑ بھی جائیں تو وہ "اللہ کو ذرہ بھر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے"۔ اسی آیت کریمہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ رسول کے بعد بھی اللہ کے آخری ضابطہ کی پابندی اور اطاعت کا وہی انداز مطلوب ہے جو رسول کی موجودگی میں اختیار کیا گیا تھا۔

آدمؑ سے لے کر محمد مصطفٰے صلعم تک تمام انبیاء و رسلؑ مات اوقُتِل کے ماتحت اس دنیا سے تشریف لے جا چکے۔ جب تک وہ یکے بعد دیگرے اپنی اپنی اُمتوں میں موجود رہے اپنی اطاعت جو دراصل خدا کی اطاعت تھی، بحیثیت زندہ اور ناطق امیر کے لوگوں سے کراتے رہے۔ اُن کے متبعین ایک شیرازہ میں بندھے رہے۔ مگر اب کہ رسولوں کی تشریف آوری کا سلسلہ رسول اکرمؐ پر ختم ہو چکا ہے اور حضور پرنورؐ بھی اپنا مشن سرانجام دے کر جہانِ آب و گل سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اس اعتصام بحبل اللہ کی کیا شکل ہے جو ایمان کی ایک اہم اور لازمی شرط بلکہ عملی گواہی ہے۔

قرآن کریم نے جو تمام زمانوں اور تمام زمانوں کی تمام اُمتوں کی حیات کا آخری اور قطعی لائحہ عمل ہے اللہ اور رسول کے بعد اُن کے نمائندہ کے طور پر اُس اولی الامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے جو "یاایھاالذین امنوا .... منکم" ہو۔ جب تک اُمت میں رسول کریمؐ بنفس نفیس موجود تھے۔ بالمشافہ حکموں کی اطاعت ہوتی رہی۔ اُمت ایک شیرازہ میں بندھی اور ایک رشتے میں پروئی

رہی۔ لیکن اسلام کا سیل سبک سیر و جہانگیر زمان و مکان کی قیود توڑ کر بڑھنے۔ پھیلنے۔ پھولنے اور پھلنے والی طاقت تھی۔ اس لئے اُن امصار و دیار میں جہاں رسولؐ کی زندگی ہی میں اسلام پہنچ چکا تھا، اُس اولی الامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا گیا تھا جو اللہ اور رسول کے لئے اپنی اطاعت لوگوں سے کرا سکے اور رسول کے بعد یہی اہتمام ابدالآباد تک ملت کی شیرازہ بندی کا کفیل بنایا گیا۔

اُولی الامر منکم کی عظیم الشان حکمت

خدا اور رسول کے بعد "اولی الامر منکم" کو ملت کی تمام توجہات کا مرکز اور احکامات کا منبع بنا کر اسلام نے اپنے پیروؤں پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ اس کا شکریہ کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اسلام سے قبل اور آج بھی غیر مسلم اقوام میں۔ ملوک و سلاطین امراء و وزراء اور دیگر اکابر و زعماء اپنی اپنی قوم کی تقدیروں کے مالک اور ان کے رہنما ہیں۔ مگر جو بلند اور مقدس مرتبہ خدا اور رسول کے جانشین کا ہو سکتا ہے اُس کو کچھ قرآن کی حامل اُمت ہی سمجھ سکتی ہے۔ قوموں کی زندگی اور زندگی کی آبرو کا دار و مدار ہمیشہ اس کے قومی اور اجتماعی نصب العین پر ہوتا ہے۔ جو قوم جس قدر بلند۔ پاکیزہ اور بے لوث مقصد حیات رکھتی ہو گی اس کا اخلاق۔ اُس کی سیرت اُس کا جاہ و جلال اور اس کی عظمت بھی اُسی نسبت سے بے مثل اور شاندار ہو گی۔ اُس قوم کی نجابت و شرافت کا کیا کہنا جس کا فریضۂ حیات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ جس کی آخری منزل اللہ کی حکومت قائم کرنا ہو۔ جس کی زندگی کی راہ انسانیت کی خدمت اور نگرانی ہو۔ یہ بلند اور ارجمند مقصد زیست کہاں سے آیا؟ اس کا سرچشمہ وہی ذات احد ہے جو فاطر السمٰوٰت والارض ہے۔ یہ ذروۂ عالیہ اُسی وقت تک نصیب رہتا ہے جب تک نگاہیں اُسی ذات بلند کی طرف لگی رہتی ہیں۔ جوں ہی نگاہ اُس طرف سے ہٹتی ہے بلندی پستی سے اور فراز نشیب سے بدل جاتا ہے اس بلند مقام پر استقلال و دوام سے فائز رہنا۔ صرف ایک ہی طرح ممکن ہے اور وہ یوں کہ اُمت کا سلسلہ رسول سے اور رسول کے ذریعہ خدا سے ملا رہے۔ مگر جیسا کہ چند سطور اوپر عرض ہو چکا رسول سے واسطہ قائم رکھنے کا قرآنی طریقہ اولی الامر منکم کے بغیر نہ صرف محال بلکہ ناممکن ہے۔ رسولؐ سے بڑھ کر کتاب اللہ کے اسرار و رموز سے آگاہ ہونے کا دعویٰ اور کون کر سکتا ہے۔ اسی رسول گرامی منزلتؐ

نے آیۂ اولی الامر کی تشریح و توضیح میں جس شدّ و مدسے قیام امارت اور اطاعت امیر کی تاکید فرمائی ہے وہ انہی گراں مایہ اسرار و رموز کے مدنظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول کے بعد مسلمان کو مسلمان رکھنا بغیر ایک جماعت۔ ایک مرکز اور اس جماعت و مرکز کے پاسباں امیر کے ممکن ہی نہیں۔ یہی شخصیت ہے جو ملت کی اُمیدوں تمنّاؤں۔ توجہات اور مساعی کے لئے نقطۂ ماسکہ بن سکتی ہے۔ اگر یہی نہ ہو تو ملت کی مثال تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون ؒ

اُولی الامر کا قرآنی مفہوم

اولی الامر کے مفہوم کے بارے میں علمائے عظام اور فقہائے کرام میں اختلاف ہے۔ یہ حسرت آفریں حقیقت تلخ ہے۔ مگر اس کا اظہار کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہی اختلاف بڑھتے بڑھتے آج ملت کے انتشار کا باعث بن چکا ہے۔ علمائے سلف نے اپنی اپنی سمجھ بوجھ اور اپنے اپنے تفقّہ کے مطابق مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور فرما کر جو نتائج اُمت کے سامنے نہایت ہی نیک نیتی سے رکھے تھے۔ اخلاف نے اُن کو بدلے ہوئے حالات اور منقلب فطرتوں کے مطابق وہ عجیب وغریب رنگ دئے ہیں کہ آج احقاق حق اور ابطال باطل بھی الحاد وزندقہ میں شمار ہونے لگا ہے۔ آہ! ؎

یہ اُمت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی!

اسلاف کرام کے یہ اختلاف محض اجتہادی نوعیت رکھتے ہیں۔ مگر وا آسفا! کہ چند صدیوں کے مرورنے ان پر خوش عقیدگی کے وہ نظر فریب غلاف چڑھائے کہ آج ان پر خود قرآن کریم ہی کی روشنی میں نظر ثانی کرنا کفر ٹھیرایا جا رہا ہے! حالانکہ ان اختلافات کی اسپرٹ قطعاً تفریق و انتشار کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً **ابن عباس**۔ جابر بن عبد۔ حسن بصری۔ عطار۔ ابو العالیہ۔ امام مالک۔ امام ابوحنیفہ۔ رحمہم اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے نزدیک اولی الامر سے مراد علمائے شریعت اور مجتہدین فقہ ہیں۔

دیگر محققین جن میں تقریباً اسی پائے کی ہستیاں شامل ہیں۔ اس سے مراد حکام سلاطین لیتی ہیں۔

اگر اس اختلاف اور اس سے پیدا شدہ نتائج پر غور کیا جائے تو ایک دردناک حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے صدر اول کے بعد اکثر و بیشتر مسلمانوں نے بھی اپنے دین کے ساتھ وہی سلوک کیا جو دوسری مردہ اور مرنے والی اُمتوں نے کیا تھا۔ اور کرتی رہتی ہیں۔ وہ یہ کہ دین و سلطنت کو عملاً علیحدہ علیحدہ حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دونوں میں مغائرت بڑھتے بڑھتے خصوصیت کا رنگ اختیار کر گئی۔ دین کے پیشوا جدا ہو گئے اور حکومت نے ان سے پیچھا چھڑایا۔ "برھمنیت" اور "ملوکیت" کے شکستہ بتوں کے ٹکڑوں کو فراہم کر کے پھر جوڑ لیا گیا۔ دونوں طرف رقابت اور تفوق کی جنگ شروع ہو گئی۔ "دین، سلطنت کا غلام ہے"، "سلطنت دین کی کنیز ہے"۔ یہ دو خطرناک فیصلے تھے جن پر رفتہ رفتہ اُمت کو پہنچا کر اجتماعی حیات کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ مسکینی و دلگیری۔ جمود و تعطل اور خواب آلود "پاکبازی" کا نام دین قرار پایا۔ جور و تعدّی اور ملوکانہ ٹھاٹھ کو "سلطنت" ٹھیرایا گیا! وہ قرآن مجید جو سلطنت و حکومت اور تقویٰ و دینداری کے جمیل ترین مجموعہ کا ضابطہ تھا۔ دونوں گروہوں کی فساد آرائی کی نذر ہو کر رہ گیا۔ ان للّٰہ و انا الیہ راجعون ۝

مگر قرآن جو ہر دور اور ہر اُمت کے لئے چراغ ہدایت ہے ان تمام حقیقت سوز مناظروں اور مباحثوں کی زندہ اور دائمی تردید ہے۔ اولی الامر کے صاف اور سیدھے معنی **صاحب امر** یعنی حکم کرنے والے کے ہیں اور حکم کا اولیں تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعمیل ہو ورنہ حکم صحیح معنوں میں حکم نہیں ہوتا۔ اور یہ تعمیل اسی شکل میں ممکن ہے کہ تعمیل کرانے والی قوت موجود ہو۔ یہی قوت ہے جس کو سیاسی زبانوں میں حکومت و سلطنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہے آیۂ اولی الامر کا ایک پہلو۔ اب دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ حقیقت خود بخود صاف ہو جاتی ہے۔ قرآن کا یہ ناقابل انکار معجزہ ہے کہ متلاشئ حق طبیعت کے لئے اس کی آیات اور مطالب میں کوئی اشکال کوئی پیچیدگی نہیں۔ آیۂ زیر بحث میں خطاب ہے یاایھاالذین اٰمنوا سے اور اولی الامر جس کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے وہ اسی ایمان لانے والے گروہ میں کا ایک فرد ہے۔ ایمان لانے والوں کی تعریف (Definition) قرآن کے

قریباً ہر صفحے پر مختلف انداز میں موجود ہے۔ دونوں پہلوؤں کو ملا کر دیکھئے تو یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سیاسی اور شرعی امارت میں تفریق نہ صرف ناممکن بلکہ آیت کی روح کو مجروح کرنے والی ہے۔ کسی آیت سے استدلال کر کے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں چیزوں میں کوئی بُعد ہے۔ زیادہ سے زیادہ۔ اور وہ بھی نہایت محتاط پیرائے میں (with reservations) ..... یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو چیزیں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں اور بس! جتنا زیادہ قرآن مجید احادیث رسول۔ اُسوۂ نبویؐ اور آثار صحابہ رضؓ پر غور کیجئے گا۔ یہ حقیقت ثانیہ زیادہ سے زیادہ تابندہ ہو کر سامنے آئے گی کہ شریعت کو حکومت و سلطنت کے لئے دلیل راہ اور حکومت و سلطنت کو شریعت کی محافظ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی خصوصی امتیاز ہے جس کا دعویٰ اسلام کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ؎

ایں دو قوت حافظ یک دیگرند!

شروع سے لے کر آخر تک دیکھ جائیے سلطنت و نبوت کا چولی دامن کا ساتھ نظر آئے گا۔ اس لئے کہ ؎

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد!

اسلام میں یہ تصور ہی باطل ہے کہ شریعت بغیر اقتدار کے زندہ رہ سکتی ہے۔ یا حکومت بغیر شریعت کے چل سکتی ہے۔ اسلام یہ فرض بھی نہیں کر سکتا کہ "بے دین سیاست" اور "غیر سیاسی مذہب" بھی کوئی چیز ہے۔ آیۂ یاایھاالذین اٰمنوا ..... منکم نے اس بحث کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ملت کا امیر وہی ہے جو "منکم" ہو اور منکم وہی ہے جو اولی الامر یعنی حکم دینے اور سنوانے کے قابل ..... اور اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول کا پابند ہو ——— انہ لقول فصل وما ھو بالھزل۔

(*)

ایک لطیف نکتہ | یہی آیت جس کا زندگی بخش ذکر ہو رہا ہے۔ آزادی و حریت کا ایک مستقل پیغام ہے ——ایمان والوں کو ایک لطیف پیرائے میں سمجھایا جا رہا ہے کہ غلامی کی زندگی میں تمہاری اطاعتِ اللہ

اور اطاعت رسول صحیح معنوں میں اطاعت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ اطاعت کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ ہے ایک امام اور ایک امیر جو ملت کے تمام امور اور قویٰ کا شیرازہ بند ہو سکتا ہے اور پھر امیر بھی ایسا امیر جو رفتار میں گفتار میں۔ سیرت میں کردار میں غرضیکہ زندگی کے کسی پہلو میں بھی کسی غیر اللہی قوت کا غلام یا زیر اثر نہ ہو۔ جہاں کہیں اور جب کبھی امیر کی یہ شان اُس سے جدا ہوئی وہ صحیح معنوں میں "ایمان لانے والے" گروہ میں سے نہیں رہتا۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کا امیر نہیں ہو سکتا قطع نظر امیر کی شخصیت کے یہ سہ گونہ اطاعت تو اس لئے تھی کہ مسلمان دنیا میں اللہ کی حکومت قائم کر سکے۔ مگر جب خود اس نے بجائے اللہ کی حکومت قائم کرنے کے۔ کسی فرعون۔ کسی شداد کسیٰ "لات" یا کسیٰ "ہبل" کی بندگی میں جینا قبول کر لیا تو امر بالمعروف اور ناھی عن المنکر کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور جب وہ اس دوگونہ پروگرام پر آزاد عمل کے قابل نہیں تو خلافت الٰہی کا قیام تو بہت بعد کی چیز ہے۔ خلاصہ ان گزارشات کا یہ ہے کہ مومنوں پر اللہ اور رسول کی اطاعت فرض ہے۔ رسول کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یہ اطاعت امیر کی اطاعت کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ افراد کی اطاعت اللہ اور اطاعت رسولؐ اپنی جگہ پر افراد کی نجات کے لئے کافی سہی۔ مگر اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ افراد امت اپنے اجتماعی فریضۂ حیات سے غفلت برت کر اُمت کو اس عذاب الیم سے نہیں بچا سکتے جو ہر خود فراموش اور خدا فراموش قوم کے لئے مقدر ہو چکا ہے جب پوری کی پوری اُمت تباہی و بربادی کے جہنم یعنی غلامی کی پلیٹ اور انتشار کے شکنجے میں کسی گئی تو افراد کی "نیکی" اور "بزرگی" کہاں باقی رہ گئی اور اسلام کے کیا کام آئی **لہٰذا** رسول کے بعد اُمت کی اجتماعی اطاعت کو قائم رکھنے کا ذریعہ صرف **امیر** ہے اور چونکہ یہ اطاعت ایک نیا نظام ایک نئی دنیا اور ایک نیا جہان پیدا کرنے کے لئے ہے۔ بغیر مطیع اور مطاع کی مکمل آزادی کے ممکن ہی نہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ہندی مسلمانوں کی اولین

صلہ غیر اللہ کے قانون کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہوئے افراد کی اطاعت "سجدے کی اجازت" سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے۔ طلوع اسلام

توجہ کا مستحق ہے۔ وہ غور کریں کہ جب ان کی زندگی کی ایک ایک سانس پر غیر اللہی قوتوں کا ہول طاری ہے۔ اُن کا دعویٰ دین و دانش خود فریبی اور خدا فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر آہ! جب مسلمان سے سے حکومت و سلطنت چھن گئی تو بجائے اس کے کہ وہ اس **ثمرِ ایمان** (انتم الاعلون ان کنتم مومنین) کو دوبارہ حاصل کرنے کی سعی کرتا اُس نے وہ تمام امور جو ایک زندہ اور آزاد ملت کی عظمت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ایک ایک کرکے اپنی حیات سے خارج کر دیے۔ جو کچھ باقی رہ گیا۔ اسمیں سے بھی چند لایعنی اور طائل جھمیلوں کو "سیاست" کا نام دیکر علیحدہ کر دیا اور بقیہ کو "دین" کا نام دے کر اعتکاف کے گوشوں۔ خانقاہوں۔ تکیوں۔ مسجدوں۔ اور قوالی کی محفلوں میں مقفل کر دیا ؎

در غلامی عشق و مذہب را فراق — انگبینِ زندگانی بد مذاق

در غلامی عشق جز گفتار نیست — کار ما گفتار ما را یار نیست

دین و دانش را غلام از راہ دہد — تا بدن را زندہ دارد جان دہد

گرچہ بر لب ہائے اُو نام خدا ست

قبلۂ او طاقت فرماں روا ست (اقبالؒ)

یہ تصویر کا وہ رخ ہے جس میں وزارتوں۔ امارتوں۔ خطابوں۔ مرتبوں اور طروں کا عشق جھلکتا نظر آئیگا غلامانہ زندگی کا دوسرا رُخ اس سے بھی زیادہ دردناک اور بھیانک ہے اور رونے کا مقام یہ ہے کہ جن لوگوں کی سیرت کے پرتو سے یہ رُخ تیار ہوتا ہے وہ بڑے بڑے "قبلہ و کعبہ" قسم کے حاملان شریعت اور وارثین منبر و محراب ہیں۔ وہ جن کو قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی میں سوائے گاندھی بھگتی اور وطن پرستی کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ستم بالائے ستم ملاحظہ ہو کہ دین محمد (روحی فداہ) کے ساتھ یہ چیرہ دستی "متحدہ قومیت" اور حریت مآبی کے نام پر ہے! افسوس ؎

از غلامی بزم ملت فرد فرد — این و آں با این و آں اندر نبرد

از غلامی مرد حق زنار بند — از غلامی گوہرش نا ارجمند

قرآن کے ساتھ مسلمانوں کا تلعب

وہ مسلمان جس کو حضرت یزداں رحمت فرماوانِ نے رحمۃ اللعٰلمین اور خاتم النبیین نبی کی امت بنا کر **خاتم اقوام** اور **خیر امم** ہونے کا مرتبہ عطا کیا تھا۔ جس کو اپنے آخری اور عظیم ترین پیغام کے حامل ہونے کا شرف بخشا تھا اس نے بتدریج اس حقیقت کو فراموش کردیا۔ کہ وہ دنیا میں اللہ کا نام بلند کرکے خود بلند اور ارجمند رہنے کے لئے ہے۔ اللہ کا نام بلند کرنے کا فریضہ جو مسلمانوں پر مولائے یثربؐ کے لطف و کرم کے طفیل عائد ہوا تھا اس نے ترک کردیا اذکروا اللہ یذکرکم کی جاں بخش نوید کے باوجود۔ ان تنصروا اللہ ینصرکم کی تائید کے باوصف اور ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانسٰھم وانفسھم کی وعید کو سنتے ہوئے اس نے اللہ کو بھلایا۔ رسول کو بھلایا اور قرآن کو بھلایا انہیں بلکہ اس نے اپنے عمل سے اللہ کی تکذیب کی۔ رسول کی (نعوذ باللہ) تردید۔ قرآن کی تغلیط کی اور نتیجہ کے طور پر اپنی عظیم الشان ملت کی تخریب کر ڈالی۔ جب اس نے یہ سب کچھ کر دیا تو اللہ کے اٹل قانون نے بھی اس کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ رہتی دنیا تک یادگار ہے۔ وہی ہندوستان جس میں اس نے ایک ہزار برس تک کوس لمن الملک بجایا تھا بے تخت و تاج اور اپنی گھٹیا سی گھٹیا احتیاج کے لئے اپنی پرانی غلام اور دنیا کی ٹھکرائی ہوئی قوم کا غلام بن کر رہ گیا۔ اس کا ملی نظام پارہ پارہ اور اس کا قومی کیریکٹر ریزہ ریزہ ہوگیا یہاں تک کہ اس کے ذہن و خیال سے یہ حقیقت رخصت ہی ہوگئی کہ وہ کیا تھا۔ غلامانہ بیچارگی اور مجبوری کی میٹھی نینداس پر اتنی غالب ہوئی کہ ذلت و رسوائی میں لذت محسوس کرنے لگا اور اس حد تک کہ اس نے اسی بے دست و پائی، اسی جبیں سائی اور آہ! اسی بے حیائی کو اصل دین و دانش قرار دے لیا ہے۔

حسن اگر از نگہش شد پنہاں
واز دل و جانش قبول کرد پیام فرنگ

بندگیٔ غیر را گفت ترقی خویش
کم نظر و کم سواد صید بدام فرنگ

بجائے اس کے کہ اس دل افگن اور ہوش ربا ظلمت میں قرآن کے نورِ مبین کو دلیل راہ بناتا اس نے اس یزدانی تجلّی کو اپنی منشاء کے مطابق جس رنگ کے شیشے میں چاہا اُتارا اور اپنی زندگی کو جو رنگ چاہا دیا۔ جس آقاؐ کے طفیل قرآن خاتم الکتب اور اس کے حامل خاتم الامم بنے اُسی آقاؐ کی شان ختم المرسلین کو (خاکم بدہن) ختم کرنے کی ملعون سعی کی گئی۔ یعنی پنجاب کی سرزمین نے ایک "پیغمبر" نمودار کیا جس نے بلطائف الحیل یہ ثابت کرنے کی ناکشکور کوشش کی کہ محمدؐ (نعوذ باللہ) خاتم النبیین نہیں۔ کملیؐ والے کا پیغام کامل واکمل نہیں۔ بطحائی حریر میں جب تک پنجابی ٹاٹ کا پیوند نہ ہو اُمت کا پیرہن تیار ہی نہیں ہوتا خداوندانِ باطل کی توفیق کے سہارے یہ چولا جو تیار کیا گیا اور اس کو قامتِ ملت پر چست کرنے کی مردود تگ و دو کمال دیدہ دلیری شروع کر دی گئی۔ اس "رسول" کو "الہام" ہوا کہ الیوم حرامٌ علی المسلمین ان یجادلوا الذین جس کا ترجمہ "الہامی" زبان میں یہ ہے کہ ؎

"دین کے لئے حرام ہے اب جنگ اور جدال
اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال"

اس "الہام" کا نازل ہونا تھا کہ غلامانہ سیرت و کردار کو آسمانی تائید کی سند بھی حاصل ہو گئی۔ جب اس طرح میدان ہموار کر لیا گیا تو اس ساری "پیغمبرانہ کاوش" کے مقصودِ اصلی کی طرف بھی قدم اُٹھا دیا گیا۔ جس آسمان سے جہاد کو حرام قرار دینے والی وحی نازل ہوئی اُسی سے یہ القا بھی ہوا کہ آیۂ یاایھا الذین اٰمنوا . . . . . . منکم میں منکم سے مراد ملک کی فرمانروا طاقت ہے ؎

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے یہ صورتِ چنگیز

مشروط اور غیر مشروط اطاعتِ امیر کی بحث

اوپر جن کوتہ آستینوں کی دراز دستیوں کا رونا رویا گیا ہے ان کی "دلق و تلمع" کے نیچے کمند صاف نظر آ رہی تھی۔ حرم کے طائرِ لاہوتی کی تیز نظر دیکھ رہی ہے کہ یہ سارا سامان دجل و تلبیس اس کو ابدی طور پر تہِ دام رکھنے کے لئے

ہے۔ مگر قیامت بالائے قیامت تو یہ ہے کہ ان غارتگرانِ دین و ملت کو چھوڑ کر عام علماء کا گروہ بھی جو ملت کی ہمدمی اور چارہ سازی کا مدعی ہے۔ لفظی نزاع۔ ہنگامہ آرائی۔ بحث و جدال اور "قال اقول" میں کھو کر اُمت کے مصائب میں اضافہ کر رہا ہے ؎

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

کسی ایک کو توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ اللہ کی رسی کی تیسری کڑی اولی الامر منکم کو پیدا کرنے کا سامان کر کے اُمت کا سلسلہ پھر خدا اور رسول سے ملا دے۔ چونکہ یہ کام ذرا مشکل ہے۔ ایک ہی امیر کو ملت کا سردار مان کر ملت کی بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹ دینے سے نام نہاد زہد و تقدس اور انفرادی اجارہ داریوں کے بت پاش پاش ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس چیز پر ہنگامۂ رستخیز برپا کیا جا رہا ہے کہ اطاعت امیر مشروط ہے یا غیر مشروط! اس تند و تیز اور ظلمت انگیز جھگڑ میں اصل مسئلہ یعنی "مرکزیت اسلام" کو صاف چھپایا جا رہا ہے ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

حالانکہ یہ بدیہی امر ہے کہ مسلمانوں کا جو امیر بھی ہوگا یا ایھا الذین اٰمنوا کے مخاطب گروہ میں سے ہوگا۔ اور اس گروہ میں سے وہی ہو سکتا ہے جو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول پر صحیح معنوں میں پابند ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں تو تو۔ میں میں۔ اور بحث و تکرار کی گنجائش ہے کہاں؟ مگر اس کا کیا علاج کہ ؎

در غلامی "دین" جز گفتار نیست

کوئی فرد جو "ابلیس کا مرید" "فسق و فجور کی دعوت دینے والا" یا "حرم پر مارچ کرنے والا ہو" مسلمانوں کے سامنے امیر بن کر آنے کی جرأت کر ہی نہیں سکتا۔ اُمت کی اس گئی گزری حالت میں بھی اتنا بڑا دھوکہ دن دہاڑے نہیں ہو سکتا۔ کتاب اللہ اور اُسوۂ رسول کی روشن قندیلیں موجود ہیں جو مطاع اور مطیع دونوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے رہی ہیں۔

قرآنی زاویۂ نگاہ جس نص قرآنی کی آڑ میں ہنگامہ بحث و تکرار گرم کیا جاتا ہے وہ زیر فکر آیۂ اطاعت

کا دوسرا حصہ ان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول" ہے۔ یعنی "اگر تمہارے اور تمہارے امیر کے درمیان کسی امر میں نزاع کی شکل پیدا ہو جائے تو اس امر کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو"۔ صرف و نحو میں اُلجھے بغیر اس آیت کا صاف اور سیدھا مطلب یہی ہے کہ مختلف فیہ مسائل اور امور کا تصفیہ صرف اللہ اور رسول کے احکامات کی روشنی ہی میں ہونا چاہیئے۔ یہی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت (ان کنتم تومنون باللہ) ہے۔ اسی آیت میں نجات ہے (ذالک خیرٌ) اور ایسے پیچیدہ مسائل میں یہی بہترین حل (best interpretation) ہے (واحسن تاویلا)

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ بحث و جدال کے متوالوں کی تردید کا سامان ہر ہر مقام پر خود بخود ہو جاتا ہے اگر صرف آیۂ یاایھاالذین ..... واحسن تاویلا کو سیاق و سباق سے بالکل علیحدہ کر کے بھی بنظر عمیق دیکھا جائے تو التباس و اشتباہ کی گنجائش قطعاً نہیں رہتی۔ جو چیز آفتاب درخشاں سے بھی بڑھ کر درخشاں انداز میں سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ امیر کی اطاعت مقصود بالذات نہیں بلکہ یہ ایک ذریعہ ہے ایک اونچے اور الہامی مقصد کا اور وہ ہے اطاعت خدا اور اطاعت رسول اس نکتہ کو واضح کرنے کے لئے قرآن نے اللہ اور رسول دونوں کے لئے اطیعوا کا لفظ استعمال کیا ہے مگر اولی الامر منکم کو رسول سے و کے ذریعہ معطوف کر دیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے امیر کی اطاعت من دون اللہ والرسول کوئی شے نہیں بلکہ حقیقتاً اللہ والرسول ہے۔ اگر بطور صریح اطیعو اللہ واطیعوالرسول واطیعوا اولی الامر منکم ہوتا تو شاید کھینچ تان کر کسی حیلے سے یہ کہنے کی گنجائش نکال لی جاتی کہ خدا اور رسول کے ساتھ ساتھ یعنی متوازی طور پر امیر کی اطاعت بھی اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ حالانکہ یہ شے تجاوز عن الحد ہے۔ جس کی سند قرآن کی کسی آیت سے نہیں ملتی۔ اٹل اور ناقابل تردید مطلب یہی ہے کہ اطاعت صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس لئے کہ ان الحکم الا اللہ اور لا یشرک فی حکمہ احداً۔ رسول کے لئے لفظ اطیعوا کی تصریح کا مطلب اس حقیقت کا اعادہ ہے کہ رسول جو کچھ کہتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے ؎

گرچہ از حلقوم عبداللہ بود　　گفتۂ او گفتۂ اللہ بود!

وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ وما ینطق عن الھویٰ۔ یہاں تک کہ رسول بھی اپنی طرف سے کچھ (من گھڑت) باتیں کہیں تو اللہ کے سخت ترین مواخذہ اور عبرتناک ترین سرزنش کا مستوجب قرار پائے ولو تقول علینا بعض الاقاویل (۴۴/۶۹)۔ لاخذنا منہ بالیمین (۴۵/۶۹) ثم لقطعنا منہ الوتین (۴۶/۶۹) فما منکم من احد عنہ حاجزین (۴۷/۶۹) ترجمہ ۔ اگر وہ (رسولؐ) بعض باتیں اپنی طرف سے ہماری جانب منسوب کرتا تو ہم مواخذۃً اس کا دایاں بازو پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے اور تم میں سے کوئی بھی اس کو بچانے والا نہ ہوتا۔"

ان تصریحات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری (اقبالؔ)

رسول کی اطاعت خدا کے لئے ہے اور امیر کی اطاعت رسول کی اطاعت کے لئے ہے جو خدا کی اطاعت سے الگ نہیں بلکہ حقیقتاً ایک چیز ہے ۔ اسی لئے ما بہ الاختلاف امور میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کی تلقین کی گئی ہے اُن لوگوں کو (اس میں مطیع اور مطاع دونوں شامل ہیں) جو ان واضح اور بین احکامات کی موجودگی میں اپنی کی سی ہانکے جائیں اور اللہ اور رسول کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں۔ طاغوت کے دامن میں پناہ لینے والے اور شیطان کے ہاتھوں میں کھیلنے والوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝

(ترجمہ) (اے نبی) کیا آپ نے اُن کو نہیں دیکھا جو دعویٰ (تو یہ) کرتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا اور آپ سے پہلے نازل ہوا اس پر ایمان لائے اور حال یہ ہے کہ شیطان سے منصفی کرانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اُن کو اس سے منکر ہو جانے کا حکم دیا جا چکا ہے (۶۰/۴) اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا اس کی طرف اور رسول کے فیصلے کی طرف آؤ تو آپ

پھر ایک آیت بعد ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا (۶۳) ایک آیت چھوڑ کر قطعی طور پر فیصلہ کر دیا گیا کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۶۵)

منافقوں کو دیکھیں گے کہ آپ سے اکڑ کر رہ جاتے ہیں (۶۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کی بات کو جانتا ہے سو آپ بھی اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیجئے اور اُن کو نصیحت کیجئے اور اُن کو ایسی مؤثر بات کہئے جو ان کے دلوں میں اُتر جائے (۶۳) (اے نبی) آپ کے رب کی قسم وہ اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ آپ کو آپس کے جھگڑوں میں منصف نہ بنائیں (اور) پھر اُن کے دل میں آپ کے فیصلہ کے خلاف پیچ و تاب پیدا نہ ہو اور اُس کو بطیب خاطر قبول کر لیں (۶۵)

اس آیت مقدسہ سے ظاہر ہے اور اس میں مناظرہ بازی اور بحث آرائی کی گنجائش نہیں کہ تنازع کی صورت میں قرآن کریم کے صریح حکم اور رسولؐ اکرم کے فیصلوں کو تسلیم کئے بغیر چارہ ہی نہیں۔ یہی اصل دین و ایمان ہے۔ جو اس سے روگردانی کرتا ہے وہ شیطان کا آلۂ کار اور سیدھی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔

اولی الامر کی اطاعت

محولہ بالا آیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سمجھنے اور غور کرنے کے قابل چیز یہ ہے کہ "تنازعتم" کی حدود کیا ہیں۔ اگر یہ حدود نظر کے حیطہ میں آ جائیں تو ہر دجل و تلبیس اور مکر و فریب کا پردہ چاک ہو سکتا ہے۔ اس باب کے شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ آیۂ یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم میں مخاطب ہی ان لوگوں کو کیا جا رہا ہے جو اللہ کی ذات پر بجمیع صفاتہ اور رسول خاتم النبیین کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ خدا، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا مطالبہ ہی ان لوگوں سے ہے جو دین قیم کے حلقے میں پوری طرح داخل ہو کر اپنی زندگیاں اسلامی ضابطۂ حیات کے قالب میں ڈھال چکے ہیں۔ اس حصار کے اندر جہاں تک ایمان باللہ والرسول کا تعلق ہے "امیر" اور "مامور" دونوں یکساں طور پر مخاطب ہیں۔ مطیع اور مطاع دونوں میں جو ہر ایمان کو مسلم اور موجود (Presupposed) قرار دے کر اُن کو تلقین کی جا رہی ہے کہ اگر

کسی موقعہ پر مسلمانوں اور ان کے امیر میں نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو وہ اس کے تصفیہ اور ارتفاع کے لئے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ یہ تلقین نہ صرف مسلمانوں کے لئے ہے اور نہ صرف اُن کے امیر کے لئے بلکہ دونوں کے لئے ہے۔ یکساں اور متوازی طریق پر ہے۔ اب یہ تنازعہ دو صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ یا تو اس کی نوعیت اصولی ہو گی یا فروعی۔ اصولی اس طرح کہ مثلاً امیر ایمان باللہ اور ایمان بالرسول اور اس دوگونہ ایمان کے قرآنی واجبات کے خلاف کوئی حکم دے یا ان میں سے کسی کا انکار یا کسی کی مخالفت اور بزور اقتدار ممانعت پر اُتر آئے۔ اگر ایسی صورت حالات پیدا ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو اس گروہ مؤمنین سے الگ کر لیتا ہے جس کی طرف اس آیت کا خطاب ہے۔ وہ امارتِ مومنین کے مقام رفیع سے لازماً اور نتیجۃً (automatically) گر جاتا ہے جس پر وہ بحیثیت "مومن" فائز تھا۔ لہٰذا نہ وہ امیر امیر ہے نہ مومن اس کی اطاعت پر از روئے قرآن مجبور ہیں۔ اگر بنوک شمشیر وہ اپنی مستبد آمریت قائم رکھتا ہے تو وہ ظالم و جابر ہے جس کے خلاف جہاد ہی میں ملت کی نجات ہے یہ تنازعہ کی انتہائی صورت ہے جس کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر اگر وہ اس غیر اسلامی آمریت کو "عین اسلام" اور اصل دین کے رنگ میں مسلط کرنے کا سامان کرے تو اس کی امارت فتنہ ہے جو بزبانِ قرآن قتل سے زیادہ برا اور شدید ہے۔ الفتنۃ اشدّ من القتل۔ اس لرزہ انگیز صورت کے مقابلے کی شکل قرآن نے ایک ہی بتلائی ہے اور وہ ہے۔ قاتلوھم حتّٰی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ ایسی صورت حالات میں دین و ملت بلکہ انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ اُس کے وجود نامسعود سے دنیا پاک ہو جائے۔ جب وہ منکم کے دائرہ سے باہر ہو گیا تو اُس کی اطاعت اللہ اور رسول کے نام پر نہیں ہو سکتی بلکہ طاغوت کو حَکَم بنانے کے مترادف ہے۔ اسی قسم کی صورتیں ہیں جن کا تفصیلی اور بین حکم زیر بحث ضمنی عنوان سے پہلے کی آیات میں پیش کر دیا گیا اگر اس جہت سے دیکھئے تو یہ کہنے میں قطعاً تامل کی گنجائش نہیں کہ امیر کی اطاعت مشروط ہے اور شرط اولیں ہے۔ ایمان باللہ والرسول۔ یعنی بندۂ مومن کا امیر وہی ہے جو منکم کی قرآنی صفت سے متصف ہو۔ تنازعہ کی یہ اور اس سے ملتی جلتی صورتیں ہیں جن میں قرآن نے "ما انزل اللہ ـــ والرسول" کی طرف رجوع

کرنیکو دعوت دی ہے۔ بلکہ یہی رجوع ہے جو نفاق و ایمان کی کسوٹی بن جاتا ہے۔

لیکن جیسا کہ ایک مرتبہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، جو شخص دین و ایمان کی روا کو اس بے باکی سے اُتار پھینکے گا وہ مسلمانوں کا امیر بن کر مسلمانوں کے سامنے آنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ جب تک "امیر" ہے اس کی گردن پر قرآن کی بے امان تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ اسلامی امارت ایک ایسی "پل صراط" ہے جو "تلوار" سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے" امیر امارت کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھا کر انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ چلنے پر مجبور ہے

اب تنازعہ کی دوسری شکل رہ جاتی ہے۔ اور وہ ہے فروعی اور سطحی اختلاف کی۔ یہ اختلاف کی وہ نوعیت ہے جو ہر زندہ ملت میں ہر لمحہ پیدا ہو سکتی ہے۔ جب تک قوم میں زندگی کا شعور اور حس موجود ہے جب تک اس کا اندیشہ جوہر حریت سے مالا مال ہے۔ جب تک اس میں غور و فکر کی صحیح و صالح صلاحیتیں موجود ہیں۔ بعض مقامات اور بعض امور میں اختلاف آرا ناگزیر ہے۔ یہی اختلاف ہے جو مآل کار اُمت کی یکجہتی اور اجتماعی یک رنگی کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ لیکن یہ چیز کبھی اور کسی قیمت پر فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ جہاں نیک نیتی کا اختلاف اُمت کے لئے برکت و رحمت ہے وہاں بد دیانتی اور خود غرضی کا اختلاف لعنت اور لاعلاج زحمت بھی ہے۔ یہ اختلاف رحمت ہے تو صرف اس حد تک کہ مختلف فیہ امر یا امور کے سارے پہلو بیک وقت سامنے آجائیں تاکہ ملت کے نصب العین اصلی یا وقتی اور ہنگامی مقصد تک پہنچنے کے لئے جتنی ممکن راہیں ہو سکتی ہیں اُن کے حسن و قبح اور نشیب و فراز کا جائزہ لیا جا سکے اور پھر ایک ایسی راہ چن لی جائے جو احسن ترین اور اقرب ترین ہو۔

اُفق مغرب سے طلوع ہونے والے علوم و فنون اور فرنگی سیاست نے جہاں انسانیت پر بیشمار عذاب مسلط کئے ہیں وہاں ایک جمہوریت بھی ہے۔ مغربی نظریۂ جمہوریت پر تنقید موجودہ مقالہ کی وسعت سے باہر ہے، سر راہے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اس کی تہ میں مساوات انسانی کا ایک نہایت ہی غلط اور غیر فطری نظریۂ مساوات کارفرما ہے۔ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے یقیناً "آدمیت احترام آدمی" ہے۔ بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔ لیکن افراد کے ماحول، ان کی تربیت۔ اُن کی استعداد اور صلاحیتوں میں فرق ہے۔ یہ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ یہی فرق ہے۔ جس کو مغربی سیاست کا تجاہل عارفانہ

نظرانداز کرجاتا ہے" جمہوریت" کے تاش کے گوندے کی بنیاد اسی غلط نظریے پر ہے۔ جس کی رو سے دس افراد کی جماعت میں اگر ۹ خر نامشخص ہوں اور اُن میں **انسان** صرف ایک ہو تو ۹ خروں کی رائے ایک انسان کے مقابلے میں صرف اس لئے معتبر ہے کہ وہ ۹ ہیں۔ یہ ازمنۂ مظلمہ (Dark ages) کی مستبد ملوکیت کا ردعمل (Reaction) ہے۔ مغربیت کے جس جس پہلو کو بھی دیکھئے گا اس میں یہی بے ہنگم افراط و تفریط نظر آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ خدائی اور الہامی ضابطے کے بغیر زندگی کے کسی پہلو کو بھی نجات نصیب نہیں ہوسکتی ایک نہ ایک چکر میں گرفتار رہنے پر مجبور رہے ؎

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر

رست از یک بند تا افتد در بندے دگر (اقبالؒ)

یہاں جمہوریت کا ذکر جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے اس افراط و تفریط کے درمیان ایک عدل و توسط کی راہ قائم کی ہے۔ فروعی اختلافات کی صورتوں میں اسلام نے دو حدیں مقرر کردی ہیں۔ پہلی حد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام امور باہمی مشورت سے طے پائیں امرھم شوریٰ بینھم۔ شوریٰ بینھم میں "جمہوریت" کی جتنی خیر و برکت ہوسکتی ہے اپنے جمیل ترین رنگ میں موجود ہے۔ دوسری حد ہے اذا عزمت فتوکل علی اللہ۔ یہی دو حدود ہیں جو اسلامی اجتماعی حکمت عملی کو متعین کرتی ہیں۔

جہاں تک اطاعت اللہ و رسول کا تعلق ہے یہ کسی شرط سے مشروط نہیں۔ اس میں تساہل، تجاہل لیت ولعل قطعاً قابل معافی نہیں۔ من یعص اللہ ورسولہ ـــــ الخ "جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اس کا ٹھکانا جہنم ہے"۔ اطاعت اللہ اور رسول کے بعد تیسرے درجہ پر اطاعتِ امیر آتی ہے امیر کی اطاعت بھی فرض ہے۔ اس لئے کہ رسول کے بعد وہی ملت کی شیرازہ بندی کرسکتا ہے۔ اس کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔ لیکن آیۂ **اطاعت** میں امیر کے باب میں ان تنازعتم نے تنازعہ کا امکان تسلیم کرکے تنازعوں کو اللہ اور رسول کے احکامات کی روشنی میں رفع کرنے کی ہدایت فرمائی ہے اوپر کی گزارشات سے یہ تو واضح ہوگیا کہ بنیادی اختلاف یہاں بڑی حد تک خارج از بحث ہے (out of question)

ہے۔ فروعی اختلاف رہ جاتا ہے" ان تنازعتم" میں ایسے ہی اختلافات کے لئے ارشاد ہوا کہ وہ اللہ کے واضح احکامات اور اُسوۂ رسول کی روشنی میں طے کئے جائیں۔ قرآن اور اُسوۂ رسول نے ہمیں زندگی کی کسی وادی یا گھاٹی میں بے دلیل و ہدایت نہیں چھوڑا۔ استنجے کے ڈھیلے کے طریقوں سے لے کر سلطنت و حکومت تک کے آئین وضع کر دئیے گئے ۔ ان حالات میں زمان و مکان کے تغیرات کے ماتحت ان اصولوں کی تطبیق (Application) میں اختلاف اور تنازعہ کی صورت ہو سکتی ہے۔ بنیادی اور اصولی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن تفصیلاً لکل شیء اور تبیاناً لکل شیء ہے۔ یہ تبیین و تفصیل اُن اصول اور کلیات کو ہمارے سامنے صاف صاف پیش کر دیتی ہے جن پر حیات اُمت تعمیر ہونی چاہئے۔ لیکن جہاں کسی فرع کو اصول سے تطبیق دینے میں اشکال پیدا ہو وہاں قرآن نے یہ اُصول پیش کیا ہے کہ اس کو اللہ اور رسول کی طرف اور رسول کے بعد اُمت کے امیر کی طرف لوٹایا جائے یعنی اس کی رہنمائی حاصل کی جائے۔ تاکہ اختلافات ناگوار حد تک نہ بڑھیں۔ اور اُمت کا شیرازہ درہم برہم نہ ہونے پائے:۔ واذا جاءھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ ط ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطٰن الا قلیلاً ○ (۴ : ۹۳) ترجمہ" ان (بدطینت) لوگوں کے پاس جب کوئی امن یا خوف کی خبر پہنچتی ہے تو وہ اس کو لے اُڑتے ہیں (حالانکہ) اگر وہ رسول کی طرف رجوع کرتے یا اُن امیروں کی طرف جو حقیقت کا کھوج نکال لیتے ہیں تو وہ اس کو خوب جان لیتے۔ (اے مسلمانو!) اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو تم میں سے اکثر شیطان کے پیرو بن جاتے"۔

ان لوگوں کو جو ایسے اختلافات میں امیر کی طرف رجوع نہیں کرتے یا اُن لوگوں سے روشنی حاصل نہیں کرتے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت عطا فرمائی ہے شیطان کے پیرو قرار دیا ہے۔

لیکن رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کے بعد جو بھی مسلمانوں کا امیر ہوا ہے یا ہوگا غیر نبی ہوگا۔ لہٰذا معصوم نہیں ہو سکتا۔ اُس سے خطا اور لغزش کا امکان ہے۔ ہر چند امور ملت کی باگ ڈور ایسے شخص کے سپرد ہوگی جو پاکیزگیٔ نفس اور سیرت و کردار میں سب سے ممتاز ہو مگر قرآن جو پیغام آخری اور فطری ہے انسانی کمزوریوں کو بجا الاؤنس دیتا ہے ان کمزوریوں کی وجہ سے امیر سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو سکتا ہے

جس سے اُمت میں اختلاف اور انتشار پیدا ہو۔ ان صورتوں میں اُس کا فرض ہے کہ قرآن و رسول کی طرف رجوع کرے۔ اور شاورھم فی الامر کے ماتحت اکابر اُمت سے مشورت کرلے مگر اس میں حکمت یہی ہے کہ یہ مشاورت نفاذِ حکم کے وقت اتمام حجت کا کام دے سکے۔ شاورھم فی الامر اور امرھم شوریٰ بینھم اُمت کی بہتری کے لئے ہے۔ لیکن جب اور جہاں اس آیت الٰہی کے ساتھ تلعب کرکے ملت کے قائم شدہ نظام اپنی ہوا و ہوس اور شر پسندی کا تختۂ مشق بنائے جانے کا احتمال ہو وہاں اذا عزمت فتوکل علی اللہ کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔ مشورت اور مشورت کے عزم کی تاکید اسی لئے ہے کہ لاطائل بحثوں۔ مجلس آرائیوں اور مناظروں میں اُمت کے قوائے عملیہ شل ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ وہ اپنے امیر کی اطاعت کرکے یکجہتی اور عزم و ثبات کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہوسکے۔ جو خدا۔ رسول اور رسول کی لائی ہوئی کتاب نے اس کے لئے روزِ اول سے مقدر کردی ہے۔

خلاصہ بحث

اس باب کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر چونکہ منکم ہے وہ بھی عام مسلمانوں کی طرح اطیعوا اللہ والرسول کا پابند ہے۔ قرآن کے واضح احکام اور اُسوۂ رسول کی تابندہ مثالیں اس کے لئے چراغ ہدایت ہوتی ہیں۔ مسلمانوں پر رسول کے بعد اس کی اطاعت اور اس کی طرف رجوع از روئے قرآن فرض اور تقاضائے ایمان ہے۔ اسلام ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرسکتا کہ ملت بے نظام اور بے مرکز حیات بسر کرے۔ اس قسم کی زندگی غیر قرآنی اور غیر اسلامی ہے۔ جو اس قسم کی زندگی پر مصر یا مطمئن ہے مومن نہیں ہے۔ مؤمن وہی ہے جو اللہ کی توحید کو زندگی کے ہر پہلو میں غالب رکھے اور اس کا اولیں مظہر قومی یکجہتی اور اجتماعیت ہے۔ لیکن چونکہ قرآن صرف اُصول پیش کرتا ہے اس لئے رسولؐ کے بعد اُن اصولوں کو حیات کے عملی مسائل پر منطبق کرتے وقت زمانی اور مکانی تغیرات پیچیدگیاں پیدا کرسکتے ہیں اور اُن کو رفع کرنے میں امیر سے جو رسول کی طرح ملہم من اللہ نہیں ہوتا۔ لغزشیں سرزد ہونے کا امکان موجود ہے۔ لہٰذا امیر کے لئے مشورت کو ضروری قرار دیا گیا۔ تاکہ اس مشورت کے بعد جب ایک متفقہ فیصلہ امیر کے حکم کی شکل اختیار کرے تو کسی فتنہ پسند یا فساد پرور طبیعت کو اس سے

سرتابی کی مجال نہ رہے۔ یہاں آکر اطاعت ناطق اور غیر مشروط ہو جاتی ہے ہر کہ و مہ کو بلا حجت و دلیل یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ ذاتی میلانات کی شہ پا کر ملت کے نظام میں روڑے اٹکائے۔

پھر اس اُمت کے لئے جس کی قوت تین سو سال سے پارہ پارہ ہو چکی ہو۔ جس کا کوئی مرکز نہ ہو۔ جس کا کوئی نظام نہ ہو۔ جس کے علماء (الا ماشاء اللہ) پیٹ کے بندے۔ اور زعماء روح اسلام سے بیگانہ ہوں۔ جس کے نشیمن کا تنکا تنکا ہوا و ہوس کے جھکڑ نے اڑا ڈالا ہو۔ جس کے صحن سے خود غرضی اور نفس پروری کی ہلاکت انگیز آندھیاں اُٹھ رہی ہوں۔ جس کے اُجڑے چمن میں بے راہ روی اور انفرادیت کی بجلیاں کوند رہی ہوں۔ جہاں اپنوں سے عداوت اور غیروں کی خوشنودی طاعت و عبادت کا درجہ اختیار کر چکی ہو وہاں اصلاح احوال کی اور کوئی شکل بھی ہے؟۔ کیا اس قسم کی طوائف الملوکی اور شیطانی ہڑبونگ کا علاج یہی نہیں کہ ایک مرد مومن اُٹھے اور پھر ان "دیر نشینوں" اور "کلیسا نوازوں" کو ایک ہی یثربی شیرازہ میں باندھ کر ایک ہی خدا کے آگے جھکا دے اور ایک ہی خدا کے آگے جھکا کر ثریٰ سے ثریا پہنچا دے۔ پھر ایک مرکز، ایک جماعت۔ ایک صف۔ ایک آواز۔ ایک کارواں۔ ایک منزل اور ایک ہی بانگ درا کا سماں پیدا کر دے۔

آج طاغوت کے نام پر اس آواز کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ اور اس مخالفت میں منبر و محراب سے لے کر قلمدان و وزارت تک ہر چیز پیچ و تاب کھا رہی ہے۔ لیکن اگر خدائے حیّ و قیوم موجود ہے۔ اگر اس کے بھیجے ہوئے رسولؐ اور ان رسولوں کا سرتاج سچے ہیں۔ اگر اسلام خدا کا آخری پیغام ہے اور اس کو زندہ رکھنے والی قوت باطل کی تمام قوتوں پر غالب ہے تو یقیناً ابلیسی طاقتیں پاش پاش ہو کر رہیں گی۔ اللہ کی توحید لفظی اور قولی بندشوں سے رہا ہو کر ملت کی عملی زندگی میں چمک کر رہے گی ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

(باقی باقی)

(**استدراک**:۔ آیۂ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کے مفہوم میں ہمیں جناب "مبصر" سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ وہ اس سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اولی الامر سے مراد مرکز کے ماتحت عمال تھے اور حضورؐ کے بعد اولی الامر سے مقصود مرکزی حکومت ہے۔ ہمارے نزدیک اولی الامر سے حضورؐ کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد بھی عمال حکومت ہی مراد ہیں مرکز مراد نہیں۔ اس لئے کہ اسلامی حکومت میں مرکز اللہ اور رسولؐ کا قائم مقام ہو جاتا ہے اس لئے مرکز حقہ کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔

اولی الامر منکم کے اس مفہوم کے بعد وہ تمام خدشات رفع ہو جاتے ہیں جن سے جناب "مبصر" کو منازعت کے بارے میں الجھاؤ پیدا ہوا ہے۔ آیۂ فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول سے مفہوم یہ ہے کہ اگر تم میں اور حکومت کے ماتحت عمال میں کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اس کے فیصلہ کے لئے تم دونوں کو چاہئے کہ مرکز کی طرف رجوع کرو۔ مرکز سے کسی کو حق منازعت نہیں۔ مرکز سے تنازع کی صورت میں مرکز اور امت دو فریق ہو جائیں گے۔ جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی سمجھ کے مطابق "خدا اور رسول کے احکام" سے استنباط کرے گا اور مناظرے کا میدان گرم ہو گا جس میں فیصلہ کی کوئی شکل نہیں نکلے گی۔ یہ اجمالی اشارات ہیں جن کی تفصیل "اسلامی نظام" (از علامہ اسلم جیراج پوری) اور "مرکزیت" (از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز) میں ملے گی۔ یہ دونوں مضمون طلوع اسلام میں شائع ہو چکے ہیں۔) (طلوع اسلام)

طلوعِ اسلام

کے

شائع کردہ پمفلٹوں کا سٹ

گذشتہ دو سال میں سیاست ہندیہ میں مسلمانوں سے متعلق کون کون سے اہم مسائل پیدا ہوئے اور اہل الرائے حضرات نے انہیں کتاب و سنت کی روشنی میں کس طرح دیکھا؟

اگر

آپ اپنے طور پر معلوم کرنا چاہیں تو آپ کو دقت ہوگی

لیکن

اگر آپ ہم سے دریافت کریں تو ہم بڑی آسانی سے آپ کو بتا سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ان پمفلٹوں میں موجود ہے جو اس دوران میں طلوع اسلام کی طرف سے شائع کئے جاتے رہے ہیں اور جو ہزار کی تعداد میں ملک میں تقسیم ہو چکے ہیں یہ پمفلٹس نہ صرف سیاست بلکہ دین کے اور شعبوں سے متعلق اہم مسائل پر بھی معلومات کا عمدہ ذخیرہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔

سٹ میں حسب ذیل پمفلٹ موجود ہیں

(۱) داردھا اسکیم اور مسلمان ۴۴ صفحات ۲؍	(۲) سوراجی مسلمان ۴۳ صفحات ۲؍	(۳) زبان کا مسئلہ ۲۶ صفحات ۲؍	(۴) خدا کی بادشاہت ۲۸ صفحات ۲؍
(۵) اسلام اور مذہبی رواداری ۲۲ صفحات ۲؍	(۶) متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی ۲۶ صفحات ۲؍	(۷) عرضداشت بخدمت علمائے کرام ۲۴ صفحات ۱؍	
(۸) اشتراکیت اور اسلام ۸۷ صفحات ۳؍	(۹) مسلمان کی زندگی ۲۲ صفحات ۲؍	(۱۰) کانگریس بے نقاب ۲۶ صفحات ۲؍	(۱۱) راشٹرپتی ابوالکلام آزاد ۲۶ صفحات ۲؍
(۱۲) شخصیت پرستی ۵۲ صفحات ۲؍	(۱۳) علم حدیث ۲۴ صفحات ۲؍	(۱۴) جہان نو ۸۰ صفحات ۴؍	(۱۵) اسلامی معاشرت ۵۶ صفحات ۴؍

یعنے ۴۴۶ صفحات کا مجموعہ دو روپیہ ۲؍ (۲؍) علاوہ محصول ڈاک۔ طلوع اسلام کے نمونے کے لئے ۴؍ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ شمیم منزل شیدی پورہ۔ دہلی

سلیم کے نام ...... چھٹا خط

سلیم! جس تامل اور تذبذب۔ جھجک اور توقف سے تم نے مسئلۂ زیرِ نظر کے متعلق استفسار کیا ہے۔ مجھے اسکا پورا پورا احساس ہے تم بھی سچے ہو۔ ایک ایسا مسئلہ جس میں کہیں کبھی۔ اختلاف نہ پیدا ہوا ہو جسکا مفہوم بالکل واضح اور جسکا مقصد بدیہی قرار دیا جاتا ہو۔ اسکے صحیح مطالب کے متعلق تردد پیدا ہوجانا۔ ایک قسم کی کھٹک کا موجب تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ اس کھٹک اور جھجک کے باوجود تمنے مجھ سے صاف صاف بات کہہ دی۔ اُمورِ دین میں طمانیتِ قلب کی خاطر۔ بخلوصِ نیت استصواب۔ خواہ وہ بظاہر اعتراض کی شکل ہی لیئے ہوئے کیوں نہ ہو۔ عمدہ نتائج کا حامل ہوتا ہے اسلیئے کہ اس سے وہ ارتیابی کیفیت جاتی رہتی ہے جسے اگر یوں زائل نہ کر دیا جائے تو وہ آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر خرمنِ ایمان و ایقان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ شکوک دبانے سے نہیں مٹا کرتے۔ سمجھنے سمجھانے سے رفع ہوا کرتے ہیں۔ جب ہمارے سامنے یہ ارشادِ گرامی موجود ہے۔ اُدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۛ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ 12/108 (میں اور میرے متبعین خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتے ہیں) تو پھر عقدۂ شبہات کو۔ قرآنی روشنی میں ناخنِ بصیرت سے کیوں نہ کھول لیا جائے۔

جیسا کہ میں نے تمہیں اس سے پہلے کبھی سمجھایا تھا۔ اِسلام کے متعلق سب سے بڑی دُشواری یہ ہوگئی کہ جب اسکا عملی دَور ختم ہوگیا تو یہ بھی باقی ادیانِ عالم کی طرح۔ ظواہر و رسوم کا مجموعہ اور جنتر منتر کا مرکب بن کے رہ گیا۔ مثلاً غور کرو کہ زندہ مسلمانوں کے زمانہ میں **عمل** اور **عامل** کا کیا مفہوم تھا اور آج ان سے کیا مطلب لیا جاتا ہے؟ تم نے بارہا لوگوں کو کہتے سُنا ہوگا کہ فلاں درویش سورۂ مزمّل کا **عمل** کرتا ہے۔ یعنی اس نے اپنے پیر و مرشد کے بتائے ہوئے طریقے پر اس سورۂ مقدّسہ کا وِرد کیا ہے اور اب اس مرتبہ پر جا پہنچا ہے کہ وہ سوئی پھونک کر دیتا ہے اور جس گھر میں وہ سوئی پھینک دی جائے۔ میاں بیوی

میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا نام ہے۔ عمل، اور عامل تو تم جانتے ہی ہو۔ جھاڑ۔ پھونک۔ تعویذ۔ گنڈے سے علاج کرنے والا۔ امتحان پاس کرانیوالا۔ مقدموں میں کامیابی دلانے والا۔ اور اسی قسم کے اور خرافات۔ وہ تھا قرآن کا عمل اور یہ ہیں قرآن کے عامل۔ درود شریف جسکے متعلق تم نے دریافت کیا ہے۔ مسلمانوں کے صحیح دورِ عمل گذر جانے کے بعد۔ اسی قسم کے عملیات میں شامل ہو چکا ہے اور اس کا مفہوم یہ رہ گیا ہے کہ فلاں طریق پر سوا لاکھ مرتبہ پڑھنے سے مصلیٰ کے نیچے سے ہر روز پانچ روپے ملجاتے ہیں۔ اور فلاں نہج پر اسکا عمل کرنے سے فلاں مصیبت ٹل جاتی ہے۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا نسخہ ہے جسکے متعلق مشہور ہے کہ — ہر مرض کی دوا درود شریف، جو اس قسم کے عمل نہیں بھی کرتے۔ وہ بھی اسکی تسبیحیں گنتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ذریعۂ نجات ہے۔ اِس سے بہت ثواب ہوتا ہے۔ گناہ جھڑتے ہیں۔ درود شریف کی برکات سے کتابوں کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ مجالس۔ محافل۔ مساجد و مواعظ میں، جہاں سنو۔ درود شریف کے فضائل و محاسن کے چرچے ہیں۔ اِس لیئے درود شریف کا کثرت سے پڑھتے رہنا ایسا مسلّمہ اور متفق علیہ مسئلہ ہو چکا ہے کہ اسکے خلاف ذہن میں ذرا سا تردد پیدا ہونا بھی گناہِ عظیم کا موجب متصور ہوتا ہے۔ لیکن ان مجالس و محافل کو چھوڑ کر آؤ تو بھلا اُس سے پوچھیں جسنے الصلوٰۃ علی النبی" (حضورؐ پر درود شریف) کو فریضہ قرار دیا ہے کہ اِس فریضہ سے مقصد کیا ہے۔ جب لڑکا بغل میں ہو تو شہر میں ڈھنڈورا "کیوں دیا جائے۔

اَے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

سورۂ احزاب میں ہے

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ۳۳/۵۶

یقیناً اللہ اور اسکے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی اسپر صلوٰۃ بھیجو۔ اور سر تسلیم خم کرو جیسا کہ تسلیم کا حق ہے!

اِس مقام پر یہ بتایا گیا ہے کہ

(۱) اللہ اور اسکے فرشتے نبی کے ساتھ صلوٰۃ کا تعلق رکھتے ہیں۔

اور حکم دیا گیا ہے کہ

(۲) مسلمانوں تم بھی نبی کے ساتھ ایسا ہی تعلق رکھو۔

اور یہ تعلق قائم ہوگا

(۳) تسلیم و اطاعت سے۔

یہ ہے سلیم! وہ حکم خداوندی جسکے ماتحت درود (الصلوٰۃ علی النبی) فریضہ قرار پایا۔ یہاں پہلے یہ فرمایا کہ اللہ اور اسکے فرشتے بھی "الصلوٰۃ علی النبی" کرتے ہیں۔ اسکے بعد مومنین کو ایسا کرنے کا حکم دیا گیا۔ اب آگے چلو دیات ذرا مشکل ہے۔ غور سے سننا۔ مشکل اسلیے کہ تمہیں شاید نئی سی معلوم ہوگی (اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ۔ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ۝ ۳۳/۴۳

اللہ وہ ہے جو۔ اے جماعت مومنین! تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے۔ اور اسکے فرشتے بھی۔ تاکہ تمہیں ظلمت (اندھیرے) سے نکال کر۔ نور (روشنی) کی طرف لے جائے۔ اور وہ مومنین کے ساتھ ترحم خسروانہ سے پیش آتا ہے

یہاں سے واضح ہوگیا کہ اللہ اور اسکے فرشتے جہاں نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ وہاں جماعتِ مومنین پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ لیکن اسکے علاوہ اس آیت سے ایک اور اہم بات بھی واضح ہوگئی یعنی یہ کہ اللہ اور اسکے فرشتوں کا یہ عمل کس لیے ہوتا ہے؟ اسلیے لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔ اب ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ درود (الصلوٰۃ) کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ وہ نبی اور اسکی جماعت کو ظلمت سے نور کی طرف لے جاتا ہے۔ اللہ اور اسکے فرشتے یہی چاہتے ہیں۔ اور مومنین سے بھی یہی ارشاد ہے کہ وہ بھی وہی کچھ کریں جس سے وہ ظلمت سے نور کی طرف نکل جائیں۔ اب سلیم! یہ چیز قابل غور ہے کہ ظلمت کیا ہے اور نور کیا ہے۔ اور ظلمت سے نور کی طرف آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ظلمت اور نور قرآن کریم میں متعدد مقامات پر آئے ہیں۔ لیکن تمہاری سہولیت کی خاطر میں صرف ایک مقام کی طرف ہی اشارہ کرونگا۔ جہاں سے واضح ہو جائے گا کہ اخراج مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (اندھیرے سے روشنی کی طرف نکلنا اور نکالنا) اپنے اندر

کیا مفہوم رکھتا ہے۔ سورۃ ابراہیم میں ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۵ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۵ ۱۴/۵

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی اپنی کھلی کھلی نشانیاں دے کر بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو ظلمت سے نور کی طرف نکال کرلے جائے۔ اور (اے رسول) ان لوگوں کو ان (عظیم الشان) وقائع خداوندی کی یاد دلاؤ جن میں صبار و شکور قوم کے لیے (عبرت و موعظت کی بڑی بڑی) نشانیاں ہیں

یعنی بنی اسرائیل جس حالت میں پہلے تھے وہ حالتِ ظلمت۔ اور پھر انہیں جس مقام پر حضرت موسیٰ لے گئے وہ مقام نور تھا۔ بنی اسرائیل کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، تم اس سے واقف ہو۔ سارا قرآن کریم اس "واقعۂ خداوندی" کے تذکرہ سے بھرا ہوا ہے۔ میں خود کئی مرتبہ اسکا اعادہ کرچکا ہوں۔ سورۂ ابراہیم کی مندرجہ صدر آیت سے اگلی آیت میں اسکی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے کہ

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۵ ۱۴/۶

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ کے ان انعامات کو یاد کرو جنسے اسنے تمہیں نوازا۔ اس نے تمہیں قوم فرعون کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی جو تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھا کرتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو قتل کردیتے تھے۔ تمہاری لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے۔ اور (اس طرح تم اپنے رب کی طرف سے (اپنے جرائم کی پاداش میں) ایک بلائے عظیم میں ماخوذ تھے۔

یہ تھی بنی اسرائیل کی پہلی حالت۔ اور دوسری حالت وہ جس کے متعلق فرمایا کہ اللہ نے اس کمزور و ناتوان قوم کو فرعون کے تخت و سلطنت کا مالک بنا دیا۔ اور حکومت و دولت انکے قبضۂ اقتدار میں آگئے۔

کچھ سمجھے سلیم! ظلمت کیا ہے۔ اور نور کیا؟ کسی قوم کا مفلسی، اور محکومی۔ ناداری اور بیکسی۔ غلامی اور ناتوانی کی لعنت میں گرفتار ہو جانا۔ ظلمت ہے۔ اور اسکے بعد اسکے ہاتھوں اس دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا

قیام نور ہے۔

اب سورۂ احزاب کی مذکورہ بالا آیت پر غور کریں جس میں ارشاد ہے کہ اللہ اور اسکے فرشتے جماعتِ مومنین کے ساتھ صلوٰۃ کا تعلق قائم کرتے ہیں تاکہ انھیں پستی و ذلت کے اندھیروں سے نکالکر عظمت و جلال کی نورانیت میں لے آئیں۔ یعنی ان کے دین کے راستے میں جسقدر موانع و مشکلات آئیں۔ انہیں ہٹاکر اللہ ان کی رہ گذر کو ہموار اور منزل کو قریب کرتا جائے۔ اور یہ تو سلیم تمہیں معلوم ہی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے تمکن دین سے مراد قیام و بقائے حکومتِ الٰہیہ ہے۔ اِس لیئے دین کے راستے کی مشکلات سے مفہوم وہ موانع ہیں۔ جو طاغوتی قوتوں کی طرف سے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے راستے میں سنگِ گراں کی شکل میں حائل کیئے جاتے ہیں۔

اتنا کچھ سمجھ لینے کے بعد سورۂ احزاب کی اس آیۂ مقدسہ پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالو جس میں ارشاد ہے کہ "اللہ اور اسکے فرشتے نبیؐ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب "الصلوٰۃ بھیجنے" سے مقصد ظلمت سے نور کی طرف لے جانا ہے تو نبیؐ کو ظلمت سے نور کی طرف سے لے جانے سے کیا مطلب ہے؟ سو واضح رہے کہ نبیؐ سے مراد محمدؐ بن عبداللہ کی ذات (Personality) نہیں۔ بلکہ مراد آپ کا پیام اور مشن (Mission) ہے، جہاں حکم ہے کہ نبیؐ کی تائید و نصرت کرو۔ وہاں یہ مراد نہیں کہ حضورؐ کی ذات کی امداد کرو۔ بلکہ یہی مقصد ہے کہ حضورؐ کے مشن کی تائید کرو۔ یعنی دین کی تائید کرو۔ جسے متمکن کرنے کے لیئے حضورؐ تشریف لائے۔ اگر ظلمت سے نور کی طرف جانے سے مقصود حضورؐ کی ذات کا غربت و افلاس کی حالت سے نکلکر دولت و حکومت کے مقام تک پہنچنا ہوتا تو اسکے لیئے کوئی مشکل ہی حائل نہ تھی۔ ابتدائی ایام میں جب کہ حضورؐ دنیاوی نقطۂ اعتبار سے بڑی مظلومی اور بیکسی کی حالت میں تھے۔ خود اہل مکہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر ملک کی حکومت و دولت اور قوم کی سیادت و قیادت حضورؐ کے قدموں میں ڈھیر کر رہے تھے۔ اور شرط صرف یہ تھی کہ حضورؐ اپنے پیغام کی تبلیغ چھوڑ دیں۔ اگر مقصد حضورؐ کا ذاتی طور پر دولت و حکومت حاصل کرنا ہوتا تو یہ پیشکش کیا بُری تھی۔ لیکن مقصد ذاتی متمکن نہ تھا۔ دین کا تمکن تھا۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام تھا۔ اسلیئے اللہ اور اسکے فرشتوں کا نبیؐ پر "صلوٰۃ بھیجنا"۔ دین نبی اکرمؐ کو موانع و مشکلات کے مراحل

سے نکالکر قوت وتمکن کے مقام پر پہونچانا تھا۔ وہی چیز جسے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ۳۳

اللہ وہ ہے جسنے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حقہ دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو تمام ادیان پر غالب کردے خواہ یہ بات مشرکین کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے!

اب تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جب "الصلوٰۃ علی النبی" کے معنی دینِ محمدی کی تائید ونصرت کرنا ہے تاکہ وہ متمکن فی الارض ہوسکے۔ تو ان دو ٹکڑوں میں باہمی ربط کیا ہے کہ پہلے تو ارشاد ہے کہ (۱) اللہ اور اسکے فرشتے اس دین کی تائید ونصرت کرتے ہیں۔ اور اسکے بعد حکم ہے کہ (۲) اے جماعتِ مومنین تم اس دین کی تائید ونصرت کرو۔ تاکہ اسے تمکن حاصل ہو۔ اس ربط کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ اللہ کی نصرت کا اُصول اور قانون کیا ہے۔ یہ موضوع ایک مستقل عنوان ہے۔ اور ضمناً اسکی تشریح مشکل، لیکن یہاں صرف ایک اجمالی اشارہ پر غور کرو۔ امید ہے بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ اللہ کی نصرت کے اُصول کے متعلق فرمایا کہ

وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ ۴۰ ۲۲

جو اللہ (کے دین) کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ اسکی مدد کرتا ہے

لہٰذا درود شریف (الصلوٰۃ) کا مطلب یہ ہوا کہ "اے جماعتِ مومنین تم اللہ کے دین کی نصرت کے لیے میدان میں آجاؤ۔ اللہ اور اسکے فرشتے تمہاری مدد کرینگے۔ اور اسطرح یہ دین ضعف وناتوانی کی ظلمت سے نکل کر قوت وشوکت کی وادیٔ نور میں جا پہونچے گا"

تم کس طرح میدان میں آؤ کہ اس سے یہ دین ظلمت سے نور کی طرف جا نکلے؟ اس کا تفصیلی پروگرام قرآن کریم کے ضابطۂ الٰہی کے اندر شرح وبسط سے موجود ہے۔ وہ قرآن جسکے نزول کا خود مقصد یہ بتایا کہ۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۙ

یہ وہ کتاب ہے جسے (اے رسول) ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کو ظلمت سے

نور کی طرف نکال کر لے جاؤ۔ ان کے اللہ کے حکم سے۔ یعنی اس راستہ کی طرف جو اللہ کا پسندیدہ ہے
اس ضابطۂ خداوندی کو اپنی زندگی کا نصب العین بناؤ۔ اور ایسی اطاعت کا شیوہ اختیار کرو جو جبر و اکراہ
کی اطاعت نہ ہو۔ بلکہ تسلیم و رضا کی اطاعت ہو۔ بطیب خاطر اطاعت ہو۔ دل کی خوشی سے اطاعت ہو۔
(و یسلموا تسلیما) اس جہادِ زندگی میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ بڑی بڑی خوفناک قوتوں کا مقابلہ
ہوگا۔ سخت آزمائش کی گھاٹیاں راستہ میں آئیں گی لیکن "اللہ کا درود" (الصلوٰۃ) اسوقت شاملِ حال ہوگا
جب تم ان تمام خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کروگے اور ان جاں گسل منازل کو استقلال و استقامت سے
طے کر جاؤ گے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَ
الثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا
إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ
وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ ۲/۱۵۵-۱۵۷

یعنیاً (اس راہ میں خطرات کے) خوف بھوک (اور پیاس) مال۔ جان اور ثمرات کے نقصان سے تمہاری
آزمائش کی جائیگی۔ پس (غلبۂ نصرت کی) خوشخبری ہے ان کے لیے جو (ان مشکلات میں) ثابت قدم رہینگے
وہ لوگ کہ جب وہ اس قسم کی مصیبت سے دوچار ہوتے ہیں تو (خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے ہوئے)
کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے (جیتے) ہیں۔ اور اسی (کی متعین فرمودہ منزل) کی طرف جاتے ہیں (اس میں
موت بھی آجائے تو کیا ہوا) یہ وہ لوگ ہیں جنپر اللہ کا درود (صلوٰت) ہے اور اسکی رحمت۔ اور یہی
ہیں جو صحیح راستہ پر جا رہے ہیں!

یہی وہ "صبار و شکور" ہیں جن کے متعلق سورۂ ابراہیم میں فرمایا کہ ان کے لیے بنی اسرائیل کی داستانِ موت و
حیات میں اللہ کی نشانیاں ہیں (إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ)

اب سلیم! تمہاری آخری بات کا جواب باقی رہ گیا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے کہ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ

اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (اے جماعتِ مومنین تم نبی پر درود بھیجو) اور ہم اسکے جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا محمد (اے اللہ ہمارے نبی پر تو درود بھیج) یعنی وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ تم درود بھیجو۔ اور ہم پھر اُسی کو کہہ دیتے ہیں کہ (تمہارے الفاظ میں) "یا اللہ۔ تو خود ہی درود بھیجدے"۔ اگر تم تصریحات بالا کی روشنی میں درود کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کروگے تو تمہاری یہ مشکل بھی بآسانی حل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں! دینِ محمدیؐ کی تائید و نصرت کے لئے میدان میں آجاؤ اسکی راہ میں جسقدر مشکلات کی چٹانیں آئیں۔ انہیں اپنے عزم و استقلال سے پاش پاش کر دو۔ تم ہمت کرکے اٹھو۔ ہماری نصرت تمہارے شاملِ حال رہے گی۔ کہ ہم اور ہمارے فرشتے[1] خود اس دین کی نصرت و تائید کرتے ہیں۔ اور اسکا غلبہ و تمکن چاہتے ہیں۔ اب اس حکم کی تعمیل میں مومنین کی جماعت تمکینِ دین کی خاطر سربکف میدان میں آجاتی ہے۔ موانع و مشکلات کا سنگِ گراں راستہ میں حائل ہوتا ہے یہ اسپر اپنے عزم و استقلال کا کدال چلاتے ہیں۔ وہ پتھر ٹوٹتا نہیں پھر اور زور لگایا جاتا ہے۔ کدال پتھر پر ہے اور نگاہیں اسکی نصرت پر۔ کدال پر کدال چلتا ہے۔ اور زبان سے دُعائیں مانگی جاتی ہیں کہ:۔

> یا اللہ! تیرا تو وعدہ ہے کہ تم اس دین کی مدد کے لیے نکلو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ اب دیکھ لے کہ ہم تیرے حکم کی تعمیل میں نکل کھڑے ہوئے۔ صلوا علیہ وسلموا تسلیماً پر عمل کرکے دکھا دیا۔ اب تیرے وعدہ کے ایفا کا وقت ہے۔ تیری نصرت کی ضرورت ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّنَا۔ یا اللہ تو اپنے رسول۔ ہمارے نبی اکرمؐ کے دین کی مدد فرما! اور اس سنگِ گراں کو راستے سے ہٹا دے۔

کدال چلائے جاتے ہیں۔ دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ تھک کر دم لینے۔ ستانے کی ضرورت پڑتی ہے تو اُسکے حضور میں (الصلوٰۃ) نماز کے لیے حاضر ہو جاتے ہیں۔ وہاں کبھی قیام میں۔ کبھی رکوع میں۔ کبھی سجود میں۔ وہی دعائیں۔ وہی تمنائیں۔ دُھرائی جاتی ہیں۔ اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ

---

[1] فرشتے کس طرح سے مدد کرتے ہیں۔ اسے کسی دوسرے وقت سمجھ لینا۔ یہاں معاملہ اُلجھ جائے گا۔ کیونکہ یہ موضوع بالکل الگ ہے۔ پرویز

(یا اللہ جو تیرے رسول کے لائے ہوئے دین کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر) ربنا فانصرنا علی القوم الکٰفرین (یا اللہ ہمیں اس قوم مخالف پر غلبہ و نصرت عطا فرما) اللّٰھم اید الاسلام والمسلمین (یا اللہ اسلام اور اس کی محافظ جماعت کی تائید فرما) اللھم صل علی محمد و علی آل محمد (یا اللہ دین محمدؐ اور اس کے قیام و بقائی ذمہ دار جماعت کو اپنی نصرت و تائید کی رحمتوں سے نواز کہ یہ دین پستی کی ظلمت سے بلندی کے نور کی طرف جا نکلے اللّٰھم اخرجنا من الظلمٰت الی النور) یہ ہے تسلیم! اس سے مفہوم کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے کہ نبی پر صلوٰۃ بھیجو۔ اور ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ "نبی پر درود بھیجے" وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ دین محمدؐ کے غلبہ و تمکن کے لئے ہمت کرو۔ ہم اس ہمت کے ساتھ ساتھ اس سے دعائیں کرتے ہیں کہ یا اللہ اپنی تائید و نصرت کو ہماری ہمتوں کے ساتھ شامل حال کردے۔ اللھم صل علیٰ نبینا محمد۔

باقی رہا یہ کہ محمدؐ کے ساتھ آل محمدؐ پر درود کے کیا معنی ہیں۔ سو اس میں شبہ نہیں کہ جیسا کہ تم نے لکھا ہے۔ ایسی احادیث موجود ہیں جن سے آل کے معنی حضورؐ کے قرابت دار مترشح ہوتے ہیں، اور اور اسی لئے آل سے مراد "سادات" یعنی بنو فاطمہ رضؓ بھی لئے جاتے ہیں۔ لیکن تسلیم! تم سوچو کہ جس رسولؐ کی بعثت اس غرض کے لئے ہوئی ہو کہ وہ دنیا سے نسلی امتیازات اور نسبی تفاخر کے غرور باطل کو مٹا کر ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کا عظیم الشان اصول قائم کرے۔ کیا اس ذاتؐ اقدس و اعظم کی طرف سے اس قسم کا حکم مل سکتا ہے۔ کہ قیامت تک ہر مسلمان اپنی نماز میں ایک خاص نسل کے انسانوں پر درود و سلام بھیجے۔ اس لئے "آل" سے مراد اگر سادات ہیں تو یہ حکم اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ آل کے معنی ملت اور قوم کے ہیں۔ قرآن کریم میں آلِ فرعون سے مراد قوم فرعون ہے۔ فرعون کی اولاد نہیں۔ اس لئے درود شریف میں بھی آل محمدؐ سے مراد ملت اسلامیہ ہے۔ اور یہ چیز قرآن کریم کی ہی تفسیر ہے۔ قرآن کریم میں۔ جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو۔ ایک جگہ ہے ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی (اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں) جس کے الفاظ بجز ہوا اللھم صل علی نبینا محمد دوسری جگہ ہے

هوالذی یصلی علیکم وملٰئکتہ (اللہ اور اس کے فرشتے مؤمنین پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ یہ ہوا اللھم صل علی ال محمد یعنی ملت اسلامیہ مفہوم یہ ہوا کہ یا اللہ تو نبی اکرم اور ملت محمدیہ کو غلبہ و نصرت عطا فرما نبی اکرم۔ حامل کتاب اللہ۔ مہبط وحی۔ اور آل محمد۔ وارثین کتاب اللہ۔ ان دونوں کی نصرت سے مقصود ہوا دین خداوندی کا غلبہ و نصرت۔ اور یہی الصلوٰۃ (درود) سے مقصود ہے۔

(*)

اب تم سمجھے سلیم! کہ درود شریف کیا ہے۔ اس درود شریف کی برکات و فضائل سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن یہ درود خاک کے آغوش میں تسبیح کے دانوں پر نہیں گنا جاتا۔ جہاد زندگی میں شمشیروں کے سایہ تلے پڑھا جاتا ہے "مذہب ملا و جمادات و نباتات" میں درود شریف کا یہی مرتبہ ہے کہ سوالاکھ دفعہ پڑھا جاتا ہے کہ سات ریپے مصلی کے نیچے سے نکل آئیں اور "مردان خود آگاہ و خدامست" کے ہاں اس کی تاثیر یہ ہے کہ ایک مرتبہ پڑھ دینے سے ہفت اقلیم میں انقلاب برپا ہو جائے۔ سوچو کہ جب جماعت مومنین۔ حزب اللہ کی آرزوئیں اور ارادے۔ ہمتیں اور ولولے۔ مشیت ایزدی سے ہم آہنگ ہو جائیں تو پھر کونسی نعمت ہے جو نہیں مل سکتی اور کونسی مشکل ہے جو آسان نہیں ہو سکتی۔ لیکن جو شخص تلوار گم کر کے محض نیام کی حفاظت میں محو ہو جائے۔ اسے کہاں کامیابی ہو سکتی ہے؟ سوچو! سلیم! کہ یہ سوچنے کی باتیں ہیں۔ چھوڑ دو سے کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ غور کرو کہ قرآن کیا کہتا ہے ؎

در ضمیر خویش و در قرآں نگر

(*)

لو یہ ہے تمہارے سب سے بڑے استفسار کا جواب۔ تمہارے خط میں کئی ایک باتیں اور بھی جواب طلب ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم ایک ہی خط میں ایسی متنوع باتیں پوچھتے چلے جاتے ہو جنہیں آپس میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ایک بات درود شریف کے متعلق پوچھتے ہو تو دوسری تعدد ازدواج کے متعلق۔ تیسری سود کے متعلق ہے تو چوتھی بیع سلوٰت کے متعلق۔ کہو کہ ایک خط میں ان تمام کا جواب کیسے لکھا جائے۔ میں تمہاری بیتابی تمنا کو خوب سمجھتا ہوں لیکن کچھ دیر اور توقف کرو معارف القرآن

شائع ہو جانے دو۔ بتوفیق ایزدی تمہارے بہت سے سوالات کا جواب خود بخود مل جائے گا۔

یہ خط گاؤں سے لکھ رہا ہوں۔ میں نے اس سے پیشتر تمہیں گاؤں کی "آمین" کے کئی عبرت انگیز واقعات سنائے ہیں۔ اس مرتبہ ایک اور خون رلا دینے والا منظر سامنے آیا۔ فتح بہشتی کا شیر خوار بچہ فوت ہو گیا۔ حسب دستور گاؤں کے جاٹ، سکھ، اور مسلمان سب جنازہ کے ہمراہ گئے۔ نماز جنازہ کے وقت سکھ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ان کے ساتھ ہی اکثر مسلمان بھی الگ کھڑے ہو گئے۔ پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ فتا اونچی آواز سے آمین نہیں کہتا اس لئے نہ اس کے جنازے کی نماز ہو سکتی ہے نہ اس کے بچے کے جنازے کی۔ اور فتا بیچارا چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ صاحب! میرے خلاف خواہ مخواہ کا اتہام لگایا جا رہا ہے۔ میں نے تو کبھی نماز ہی نہیں پڑھی۔ مجھے آمین کے جھگڑے سے کیا تعلق۔ میں نے ایک دن اس آمین والی جماعت کے چوہدری سے کہا کہ تمہارے گاؤں میں کوئی شخص اپنی جائداد میں سے لڑکی کو حصہ نہیں دیتا۔ حالانکہ قرآن کریم میں لڑکی کا حصہ موجود ہے۔ تم لوگوں نے کبھی اس کے متعلق تو ایک لفظ تک نہیں کہا۔ اور آمین کے اختلاف پر بیس برس سے لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ کہنے لگا کہ صاحب! جائداد کی تقسیم تو رواج کے مطابق ہوتی ہے اور آمین شریعت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے شریعت کے معاملہ میں ہم کبھی اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتے۔

دیکھا سلیم! مسلمان کتنی سستی جنت خریدتا ہے! تقسیم جائداد میں چونکہ مال کا نقصان ہے اس لئے وہ رواج کے مطابق ہو گی۔ اور جنت کا فیصلہ خفی اور جہر آمین پر ہو گا۔

تم کہو گے کہ وہ تو جاہلوں کا طبقہ ہے لیکن دیکھو تو سہی کہ تمہارے ہاں دانشمندوں میں کیا ہو رہا ہے۔ فوجداری کے قانون میں مانا کہ گورنمنٹ کا حکم ہے۔ اس کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا لیکن دیوانی کے قانون میں تو تمہیں اختیار حاصل ہے کہ تم چاہو تو شریعت کے مطابق فیصلے کر لو لیکن تم عدالتوں میں جا کر دیکھو کتنی بڑی بڑی مقدس ہستیاں علانیہ کہہ دیں گی کہ ہمارا فیصلہ رواج کے مطابق ہو گا۔ شریعت کے مطابق نہیں۔

ایک دن شہر میں گیا۔ وہاں ایک بڑا دلچسپ واقعہ دیکھا۔ سن لو۔ کہ تمہارے موجودہ استفسار سے بھی متعلق ہے۔ میں نے دیکھا کہ محلہ کی مسجد دن بھر کی نمازوں میں ویران ویران سی تھی لیکن عشاء کی نماز کے وقت وہاں ایسی ایسی شکلیں نظر آتی تھیں جنھیں اس سے پہلے کبھی مسجد میں نہ دیکھا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ سردیوں کے موسم میں عشاء کی نماز تو بڑی گراں گذرا کرتی ہے۔ ان لوگوں کو دن میں تو دیکھا نہیں۔ عشاء کی نماز میں خصوصیت سے آنا۔ چہ معنی! صبح میں نے یونہی گاموزی سے پوچھا وہ ہنس پڑا۔ کہنے لگا کہ یہ واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ شہر میں آج کل سٹہ بازی کا بڑا زور ہے (یہ ایک قسم کا جوا ہوتا ہے) باہر ایک فقیر آیا ہوا ہے جو بتاتا ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد یہ وظیفہ پڑھو تو خواب میں سٹہ کا نمبر معلوم ہو جائے گا۔ اس لئے شہر کے سب سٹے باز عشاء کی نماز پڑھنے لگ گئے ہیں۔ اور اس کے بعد آدھی رات تک وظیفہ بھی کرتے رہتے ہیں

دیکھا سلیم! تم نے کہ دین اب کس مصرف کے لئے رہ گیا ہے؟ اور ایک سٹے بازوں پر ہی کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کو تم دیکھو گے کہ کچھ اسی قسم کے اغراض کے لئے ہی نماز اور وظیفے پڑھیں گے۔

والسلام پرویز

ہندوستان کے مسلمانوں کا جائزہ

اور

دعوتِ عمل

(مولوی مشتاق احمد صاحب۔ فاضل دیوبند۔ مولوی فاضل۔ لیہ ضلع مظفرگڑھ)

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم　　فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

ماضی کی سیر

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت کے وقت ظھر الفساد فی البر والبحر کے مصداق تمام دنیا اور دنیا کا ہر ایک خطہ اور اسی خطہ کی ہر ایک قوم مجسم فساد بن گئی تھیں۔ جب اُن سے کہا جاتا کہ لا تفسدوا فی الارض (زمین میں فساد مت کرو۔ تو وہ کہتے (قالوا) ہم ہی تو مصلح ہیں (انما نحن مصلحون) نیکی کی بجائے بدی۔ علم کی بجائے جہالت، ثواب کی بجائے گناہ، حق کی بجائے باطل، روشنی کی بجائے تاریکی، سفیدی کی جگہ سیاہی، اور اسلام کی بجائے کفر روئے زمین پر چھایا ہوا تھا۔

اگر برائے نام کوئی حق والی جماعتیں تھیں تو وہ قوم موسیٰ المعروف یہود۔ اور قوم عیسیٰ المعروف نصاریٰ تھیں۔ جو اہل کتاب ہونے کی مدعی تھیں مگر ایک کا دوسرے سے یہ سلوک تھا کہ یہود کہتے "کہ نصاریٰ کی کسی چیز میں حق پر نہیں ہیں (وقالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ شیئ) اور نصاریٰ کہتے کہ یہود کی کسی چیز میں حق پر نہیں ہیں (وقالت النصاریٰ لیست الیھود علیٰ شیئ) حالانکہ وہ سب کتاب کی تلاوت کرتے تھے (وھم یتلون الکتاب) لیکن جہاں ان کی منشا کے خلاف کتاب (تورات اور انجیل) کا کوئی حکم نظر پڑتا اسے بدل دیتے۔ لفظ توڑ موڑ کر پڑھتے۔ اور معنی میں بھی تحریف کر ڈالتے۔ یا سرے سے دوسرا لفظ رکھ دیتے (یحرفون الکلم عن مواضعہ) اور کئی باتیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر لوگوں سے کہتے کہ ان کا لکھا خدا کا لکھا ہے۔ یعنی ان کے دستخطوں اور نقوش سے مزین عبارت، خدا کے کلام کی جگہ لے لیتی اور خدا کا کلام قابل عمل نہ ہوتا۔ اسی لئے احبار (علماء)

اور رہبان (درویش و فقراء اور باصطلاح حال پیرانِ عظام) اللہ تعالےٰ کی بجائے ارباب (اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ) بنے ہوئے تھے۔ یعنی جس کو احبار اور رہبان حلال کرتے وہ حلال ہوتا اور جس کو حرام کرتے وہ حرام مگر خدا کا حلال ان کے لئے حلال نہ ہوتا اور خدا کا حرام اُن کے لیے حرام نہ ہوتا۔

عوام کی یہ حالت تھی کہ چند رسوم اور عادات اُن کے ہاں مذہب کا خلاصہ تھیں بلکہ مذہب تھیں۔ ایک رسم کے نہ ہونے سے وہ مذہب سے بیزار سمجھے جاتے۔ اصل مذہب سے ان کو واقفیت تک نہ تھی البتہ ظاہری طور پر کتاب مقدس ان کے ہاں اسی قدر مقبول تھی کہ اس کو آنکھوں پر رکھتے، چومتے، حلفیں اُٹھاتے، اسے جھوم جھوم کر پڑھتے۔ جزدانوں اور غلافوں میں رکھتے۔ بیماروں کے لیے اس سے استشفاء کرتے۔ غرض اپنی آرزوؤں کو مذہب سمجھتے (ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی)

کعبہ کے پرستاروں کی یہ حالت تھی کہ آدمیت کے حقوق کو پوری طرح غصب اور سلب کیا ہوا تھا کعبہ کے متولی ہونے کو فخر سمجھتے تھے۔ حج کے دنوں میں حاجیوں کے لئے سبیلیں کھولتے اور مسجد حرام کی آبادی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے۔ مگر جہالت کی یہ حالت تھی کہ۔

؎ کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا ٭ کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

بات بات پر مدتوں تلوار نیام میں نہیں داخل ہوتی تھی۔ قوموں کی قوموں کا صفایا ہو کے رہتا

نبوت کا ظہور

غرض اسی بُری حالت سے دنیا کی کوئی قوم اور کوئی ملک بری اور بیزار نہیں تھا سب فساد میں یکساں تھے۔ کہ مشیت ایزدی کے مطابق ابراہیمی دعا اور مسیحی نوید کے پورا کرنے کا وقت آگیا۔ تاکہ وہ آنے والا آئے اور باری تعالےٰ کی آیات کی تلاوت کرکے اس کے متبعین کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ چنانچہ ابراہیمی خاندان سے اسمٰعیلی شاخ حضرت عبداللہ کے گھر سے حضرت آمنہ کا لال پیدا ہوا۔ مگر وہ لوگ جو کتب سابقہ الہامیہ سے آخری نبی کے منتظر تھے۔ سراسر انکار کر گئے الا ماشاء اللہ (فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ) حالانکہ علامات فرمودہ انبیاء علیہم السلام سے ان کو پوری اور سچی معرفت تھی۔ مگر کچھ تو اپنی نخوت طبعی اور کچھ

فساد کے خوف سے ان میں حق کی قبولیت کی قوت معدوم ہو گئی (یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم)

شانِ نبوت

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچپن اور جوانی کو اس شاندار طریق سے دنیا کے سامنے رکھا کہ وہی حصہ مستقبل کے لئے دلیل راہ بن گیا۔ آپ نے پورے چالیس سال اس ماحول میں رہ کر جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے اس قدر پاکیزگی سے گزارے کہ تمام لوگ آپکو امین (امانت دار) اور صادق (سچا) کے القاب سے یاد کرنے لگے۔ یعنے تمام عرب میں اگر امانت اور صداقت کا کوئی حامل تھا تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے۔ آگے چل کر نہ صرف نبی بلکہ خاتم الانبیاء آخری نبی بننے والے تھے۔ اور جو نہ صرف عرب کے لوگوں بلکہ کافۃ للناس کے لئے رسول تھے (یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا) آپ نے جونہی نبوت کا اعلان کیا رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ طاہرہ نے، احباب میں سے حضرت ابو بکر صدیق نے۔ اور کمسن جوانوں میں سے حضرت علی نے فوراً لبیک کہا۔ اور آپ کی صداقت پر ایمان کا اظہار کیا۔ اس شخص کی صداقت پر بھلا پھر کسی کو کیا انکار ہو سکتا ہے۔ جس کی بیوی سب سے پہلی تصدیق کرنے والی ہو۔ اور جس کے احباب سب سے پہلے اُسے سچا اور صادق سمجھیں۔

اب مکہ کی یہ حالت ہو گئی کہ مخالف لوگوں نے راستوں کو بند کر دیا جو باہر سے لوگ آتے انہیں روکتے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات نہ کریں۔ اور ماننے والوں کو بھی دق کرنے لگے آپ یہاں سے مدینہ طیبہ کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں جا کر ایک مکمل اور جانباز جماعت تیار کر دی۔ جو آپس میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رحمدل، مہربان اور رحیم تھی۔ اور مخالفوں اور منکروں کے مقابلہ میں شدید اور مضبوط (اشداء علی الکفار رحماء بینہم) تئیس سال کے عرصہ میں خدائے تعالیٰ کا پیغام مکمل ہو گیا اور نعمت الٰہی تمام ہو کر رہی (الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی) اور خدائے تعالیٰ کا پسندیدہ مذہب دنیا کے لئے 'دین' مقرر ہوا (ورضیت لکم الاسلام دینا)

شانِ خلافت

اور جماعت (جو رحیم و شدید تھی وہ خدا تعالیٰ سے بھی رضامندی کا سرٹیفکٹ حاصل کر چکی (لقد رضی اللہ عن المومنین) رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ

چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پورے تریسٹھ برس دنیا میں رہ کر تیئیس برس نبوت کی شان دکھا کر اور قرآن کی عامل جماعت چھوڑ کر آخرت کو سدھارے اور اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے (اللھم الرفیق الاعلیٰ)

آپ کے اس پیغام کے حرف حرف پر خلافت راشدہ نے پوری طرح عمل کیا اور دنیا سے عمل کرایا حکومت الٰہی جو قرآن کریم کا اصل مقصد تھا دنیا میں قائم کر دکھائی۔ خلافت ارضی۔ جو اسی حکومت الٰہی کا اثر اور عکس تھا خادمان نبوت کو ملی۔ روم، مصر، شام، اور ایران وغیرہ ممالک مفتوح ہوئے۔ ہر جگہ توحید (لا الہ الا اللہ) اور حکومت الٰہی (ان الحکم الا للہ) اور رسالت (محمد الرسول اللہ) کا جھنڈا نصب کر دیا گیا باہمی کوئی اختلاف نہ تھا۔ سب کا قبلہ مقصد اور کعبہ مراد ایک تھا۔ عمل صالح اور عدم شرک منتہائے نظر اور نصب العین تھا (فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً) اگر کوئی اختلاف تھا بھی تو توحید میں نہ تھا، رسالت میں نہ تھا۔ قرآن یعنی نصب العین اور مطمح نظر میں نہ تھا۔ زندگی سب کی ایک تھی ایک ایک آدمی کی طرح (المومنون کرجل واحد۔ الحدیث) سب کی نشست برخاست تھی ایک کی تکلیف سے سب تکلیف میں تھے۔ ایک کے بیمار ہونے سے سب بیمار ہو جاتے تھے (اذا اشتکی عینہ اشتکی کلہ واذا اشتکی بعضہ اشتکی کلہ الحدیث) کہیں خلاف نہ تھا اور کہیں مخالفت نہ تھی (فالف بین قلوبھم) کوئی کسی کا دشمن نہ تھا۔ سب ایک تھے۔ ایک دوسرے کے بھائی تھے (انما المومنون اخوۃ) سب کا کام باہمی توصیۂ حق و صبر اور اصلاح خلق تھا۔ کوئی فرقہ نہ تھا۔ کوئی قوم نہ تھی ایک ہی قوم تھی اور ایک ہی جماعت۔ ہاں اگر اختلاف تھا تو رنگ کا۔ قد کا۔ نام کا۔ زبان کا۔ لباس کا۔ ملک کا۔ یہی اختلاف خدا تعالیٰ کی آیات میں سے ہے (ومن ایاتہ اختلاف السنتکم والوانکم) یا اگر اختلاف تھا تو آراء کا اختلاف تھا۔ مگر اختلاف آراء سے قبلہ جدا نہیں ہوتا تھا۔ رائیں اگر مختلف ہوتیں تو ایک ہی قبلہ کیلئے جس سے مقصد آزادئ ضمیر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ مگر خلافت راشدہ کے ختم ہونے پر یہ اخوت اور وحدت یہ اجتماعیت اور کرجل واحد کی مشابہت آہستہ آہستہ بدلتی گئی۔ جبکہ خلافت عباسیہ میں ایک مسلمان کی سینکڑوں شکلیں دکھائی دینے لگیں۔ کہیں فقیہ، کہیں محدث۔ کہیں متکلم، کہیں فلاسفر، کہیں منطقی کہیں نحوی غرضیکہ اختلاف کا ایک طوفان آیا یہی زمانہ ہے جس میں مسلمانوں کو آرام پسندی کی ہوا میں بیٹھکر تصنیف کا

کا موقعہ ملا اور سینکڑوں شکلیں فرقوں کے رنگ میں نمایاں ہوگئیں۔ یہی زمانہ ہے جس میں ہزاروں تفسیریں لکھی گئیں۔ سینکڑوں حدیث کی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ فقہ کے مختلف سکول پیدا ہوگئے۔ علم عقائد کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور اسی زمانہ میں لاکھوں حدیثیں وضع ہوئیں ہلاکو خاں کے فتنہ سے اٹھارہ لاکھ انسان بغداد میں تہ تیغ کئے گئے۔ اور لاکھ کے قریب آدمی دیواروں میں چنوا دئے گئے۔ جن کے متعلق یہ شک تھا کہ شاید کل کوئی حکومت کا دعویٰ کر بیٹھے اور کروڑوں کتابیں آگ کی نذر ہو کر خاکستر ہوگئیں۔ غرض مسلمانوں کی خوب چھٹائی ہوئی۔

ہندوستان

مجھے دنیا کے باقی مسلمانوں کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے گھر کی باتیں گھر والوں سے کہنی ہیں ہندوستان میں مختلف ممالک سے مسلمان آئے فتوحات کرتے چلتے بنے۔ جو لوگ رہ گئے سیاحت کی غرض سے آئے یا تجارت کی تو انہوں نے اسلام کی تبلیغ کی۔ آخر مغلیہ خاندان نے یہاں آکر صرف فاتح کی صورت اختیار نہ کی بلکہ ہندوستان کو گھر سمجھ کر یہاں کے ہو رہے یہاں مرے اور یہاں دفن ہوئے۔ اور کئی نسلوں تک ہندوستان میں حکومت کرتے رہے

یہ زمانہ قابل غور ہے۔ بادشاہوں کو صرف اپنی حکومت اور سلطنت سے واسطہ رہا صحیح اسلام یہاں آکر مختلف صورتیں اختیار کر گیا۔ کچھ تو بغداد کی تباہی کے بعد بقیۃ السیف مسلمان منتشر ہو کر ہندوستان میں پہونچے۔ اور وہی اختلاف جو سلطنت عباسیہ میں پیدا ہو گیا تھا ہمراہ لائے۔ پھر ہندوستان کے اصلی باشندوں کو جو برہمن۔ کھتری۔ ویش اور شودر۔ درحقیقت چار قوموں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ جن کا کھان پان۔ بود و باش اور شادی غمی بھی ایک دوسرے جدا تھی۔ دیکھکر اسی اختلاف کو خوبی ہوا لگی۔ اور مسلمان ایک ہی وقت میں کچھ تو برہمن (مولوی یا پیر) بن گیا۔ اور کچھ کھتری (فوجی سپاہی یا ملازم) اور کچھ ویش (تجارت پیشہ یا زراعت پیشہ) اور کچھ شودر (مزدور یا کمین) ایک کو دوسرے سے کوئی اخوت اور محبت نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ہمسایہ قوم کا اثر غالب ہو چکا تھا۔ یا وہ چیز وراثتہً ان میں آگئی تھی کیونکہ ہندوؤں سے بھی کئی خاندان مسلمان ہو گئے تھے۔

رفتہ رفتہ چونکہ حکومت کو مولوی اور پیر کے افعال اور اعمال سے غرض اور واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے

حجرہ اور مسجد میں بیٹھکر مذہب کی ہوا کو خوب بگاڑا (تذھب ریحکم) اور اللہ تعالے کے حبل یعنی رسّی کو مضبوط پکڑنے کی بجائے انسانوں سے تعلق مضبوط کر لیا (واعتصموا بحبل اللہ جمیعا) انہی دنوں میں مسلمان اہل سنت سے حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور اس سے ذرا آگے چشتی، نقشبندی، سہروردی اور قادریہ کے علاوہ سینکڑوں شاخوں میں تقسیم ہوگیا۔ اور اسلامی سلطنت کے زائل ہو جانے کے بعد تو اب مرزائی، اہل حدیث اہل قرآن، اہل سنت، اہل شیعہ اور پھر ہر ایک کی متعدد شاخیں اسی طرح نمودار ہوگئیں کہ گن کر بہتر فرقے پورے ہو جاتے ہیں (بلکہ بڑھ جائینگے) جو فرق کی پوری تصویر ہیں (ولا تفرقوا) سچ پوچھئے تو ہر ایک مولوی جہاں بیٹھا ہے وہ خود ایک فرقہ ہے یا بانئے فرقہ ہے۔ ایک واعظ جہاں ہوتا ہے خود ایک مذہب ہے، یا بانی مذہب ایک پیر صاحب جہاں تشریف فرما ہیں بس پورے نائب رسول ہیں۔ رسولؐ کا علم کسی کو ہو یا نہ ہو۔ پیر سے محبت ضرور ہو۔ بے پیر کا فر ہوتا ہے۔ مگر بے رسول مسلمان ہوتا ہے۔ پیر ہندوستان میں نائب رسولؐ ہی نہیں رہا۔ بلکہ خدا کی گدی پر بھی براجمان ہوتا ہے یہ تو ہے مذہب کی حالت جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ہندوستانی مسلمان۔

۱۔ اہل سنت میں سے ہے تو وہ۔

حنفی ہے یا شافعی یا مالکی یا حنبلی (مگر اکثر حنفی ہیں اور باقی تین سلسلے کم) اور چشتی نقشبندی قادری اور سہروردی (اور ان کی شاخیں)

۲۔ یا اہل حدیث ہے اور وہ غیر مقلد مشہور ہے۔ جو تقلید کو شرک بھی کہتا ہے۔

۳۔ یا اہل قرآن ہے جو حدیث کا سرے سے انکار کرتا ہے۔

۴۔ یا پیر پرست ہے جو پیر کے ہر قول و فعل کو "گفتۂ اللہ" سے کم نہیں سمجھتا۔

۵۔ یا مرزائی ہے (قادیانی یا لاہوری) جو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مجدد (حسب اختلاف قادیان و لاہور) سمجھتے ہوئے ان کو حکم قرار دیتا ہے۔

۶۔ اور خدا معلوم کیا کیا ہے۔

سیاست ۔ اس سے آگے مسلمان نے مذہب کو سیاست سے جدا سمجھ کر اس کے لئے بھی اتحاد

کی کوئی راہ نہیں ڈھونڈھی ۔ اور اس میں بھی وہی انتشار اور تشتت نظر آتا ہے ۔ جو مذہب کے بارے میں پہلے مذکور ہو چکا ہے ۔ یعنی کہیں کانگریس نظر آتی ہے تو کہیں مسلم لیگ ۔ کہیں جمعیت العلماء ہے تو کہیں اتحاد ملت کہیں احرار ہیں تو کہیں خاکسار ۔ میرے اللہ اب تو ایک انار اور صد بیمار والی حالت ہے ۔ آدمی جائے تو کہاں جائے ۔ ہم سے پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ ہم نے مذہب کو حجرہ میں مقید رکھا اور سیاست اوروں کے حوالہ کی اور سیاست میں ادھر اُدھر جھانک کر مختلف ادارے اور اڈے قائم کر لئے

اگر کانگریس میں جاتے ہیں تو مسلم لیگ سے آوازوں پر آوازے کسے جاتے ہیں ۔ اگر مسلم لیگ میں جائیں تو جمعیت العلماء مطعون کرتی ہے ۔ غرض ایک دوسری کی ضد معلوم ہوتی ہے ۔ احرار خاکسار کے دشمن ہیں اور خاکسار احرار کے ۔

ہمسایہ اقوام پر نظر

ہمارے برادران وطن ہیں تو ہر جگہ اپنی آواز کو زندہ رکھنے کی دھن میں ہیں ۔ اُن کا مذہب اور سیاست ایک معلوم ہوتا ہے ۔ ہندو مہاسبھا ہو یا کانگریس ۔ نام جدا جدا ہیں مگر روح ایک ہے جو دونوں میں کام کر رہی ہے ۔ اور ایسی سیکڑوں سبھائیں ہندوؤں کی موجود ہیں ۔ طریق کار میں اختلاف ہو تو ہو مگر مقصد میں اختلاف نہ ہوگا ۔ شکلوں میں اختلاف ہوگا مگر روح ایک ہوگی ۔

درس عبرت

اے کاش مسلمان سوچتے سمجھتے ، اپنے گھر کو دیکھتے ۔ ماضی پر نگاہ پلٹ کر ڈالتے تو ان کو وہاں سب کچھ نظر آتا (لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم میں ان کو پورا پورا اسوہ مل جاتا (علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین) خلفاء راشدین رضی میں اُن کو زندگی کے گزارنے کا صحیح طریقہ نظر آتا ۔ وہ دیکھتے کہ مذہب اور سیاست کے فرق کو انہوں نے کس طرح حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا ۔

بالفرض مسلمان اگر تقسیم کار کے اصول پر بھی عمل پیرا ہوتا تو اپنی مضبوطی اندرونی نظم و نسق میں مسلم لیگ کے ذریعہ ، مولوی اور پیر کے ذریعہ ، امیر اور دولتمند کے ذریعہ ، حجرہ اور خانقاہ کے ذریعہ کرتا ۔ یعنی ہر حالت میں پیش نظر ملت کی مضبوطی ہوتی اور اسطرح مسلمان کا نظام مضبوط کرتا

اُسے حبل اللہ کے ساتھ اعتصام کراتا۔ اُسے تفرق اور تشتت سے باز رکھتا۔ مگر ہوا تو یہ کہ ہر ایک مسلمان بجائے خود ایک فرقہ ہے، ایک سیاست ہے۔ اگر اسطرح مسلم لیگ کے ذریعہ اندرونی نظم و نسق مضبوط ہو جاتا۔ مسلمان ایک ہو جاتا۔ رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ کی سچی اور صحیح تصویر بن جاتا تو پھر اس کے بعد (اشداء علی الکفار) کی حالت میں ایک قوم کی حیثیت سے خواہ کانگریس کے ساتھ مل کر کسی سے مقابلہ کرتا۔ یا کانگریس سے الگ رہ کر کسی کے آگے اپنی ہستی کا مظاہرہ کرتا۔ تو ایک بات بھی تھی۔ میری رائے تو یہ ہے کہ مسلمان احرار سے حریت ضمیر۔ اور آزادی کا سبق لے۔ 'خاکساروں' سے سپاہیانہ جذبہ، اطاعت امیر اور خدمت خلق سیکھے۔ اتحاد ملت سے وحدت فی الملت کا سبق لے۔ جمعیت العلماء سے علم کی راہنمائی حاصل کرے۔ مسلم لیگ' سے باہمی تنظیم اور ربط و ضبط سیکھے۔ اور یہ سب ادارے باہمی ایسے منضبط اور منسلک ہوں کہ سب کا سررشتہ ایک ہو جو ختم نبوت اور قرآن کریم، کو اپنا مرکز قرار دے۔ پھر اسی مرکز سے چند نمایندے حسب ضرورت کانگریس میں جاکر اپنی امتیازی اور ملّی زندگی کو قائم رکھتے ہوئے کسی پروگرام یا لائحہ عمل سے اتفاق کرلیں۔ یہ نمائندے کہیں چلے جائیں۔ ملّت کا استحکام انکا مقصد اور اعلائے کلمۃ اللہ ان کا نصب العین ہوگا۔ موجودہ حالت میں جبکہ نیچے سے مکان کھوکھلا ہو اور سینکڑوں فرقوں میں متفرق موجودہ حالت میں جبکہ کانگریس میں ملنے والے۔ ہماری امتیازی یا ملّی زندگی کو برقرار رکھنے کی بجائے تمام قوم کو ایک بڑی قوم میں مدغم کرکے وطن کی عمارت قائم کرلیں تو مسلمانوں کا جنازہ کل کا نکلتا آج نکل جائیگا۔

ڈر اور خطرہ پھر ڈر ہے، خطرہ ہے۔ جو حالت اندلس میں مسلمانوں کی ہوئی وہی ہندوستان میں نہ ہو جائے جس مسلماں کا قرآن عربی میں ہے نماز عربی میں ہے' پیغمبر عربی زبان میں کلام کرتا ہے، تمام لٹریچر عربی ہے۔ عربیت سے تو خیر ناآشنا ہو ہی چکا ہے (صرف نماز وغیرہ کچھ ایسی چیزیں رہ گئی ہیں) وہ اگر اردو زبان سے جو شکل و صورت میں عربی رسم الخط سے ملتی ہے۔ اور جس میں عربی کے الفاظ بھی سما سکتے ہیں۔ کنارہ کش ہو جائے اور ہندی زبان کو مشترکہ ملی زبان قرار دے لے تو نہ اس کا کلچر باقی رہ سکتا ہے اور نہ زندگی کے شعبہ جات میں کوئی چیز اسلامی رنگ میں باقی رہ سکتی

ہے۔غرض۔

؎ گرہمیں مکتب است ایں ملّا کار طفلاں تمام خواہد شد

راہ عمل آؤ علامہ اقبال مرحوم کے فلسفۂ حیات پر عمل کریں۔ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال کی پرانی تہذیب پرانے مذہب اسلام اور اسلام کی کتاب قرآن کریم اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ حسنہ کو اپنی کتاب عمل اور اسوۂ راہ بنائیں۔ اور تمام باہمی۔ ذاتی اختلافات کو مٹا کر ایک ہی راہ اور ایک ہی کعبہ کو۔ راہ اور منزل بنائیں۔ اور خدا تعالےٰ کے اس پیغام کو اپنے لئے گفتہ آید در حدیث دیگراں یعنی سرّ دلبراں سمجھتے ہوئے غور سے سنکر اس پر متفقہ عمل کریں۔ قُلْ یٰاَھلَ الْکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواءٍ بیننا وبینکم ان لاتَعْبُدُ الا اللہ وَلانشرک بہ شیئًا وَلایتخذ بَعْضُنا بعضًا اَرباباً من دون اللہ آیۃ کی روشنی میں مسلمانوں سے یہ عرض ہوگا۔ کہ اے اہل اسلام۔ اے مدعیان عمل بالقرآن و بالکتاب آجاؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے یعنی ہم سب میں برابر اور مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالےٰ ہی کی عبودیت اختیار کریں۔ اور اس کے حکم ہی کے آگے گردن جھکائیں۔ آؤ اس کی عبودیت اور اس کے حکم میں کسی کو شریک نہ بنائیں۔ کسی اور کو اپنا آقا نہ سمجھیں اور نہ کسی کی غلامی کریں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ تعالےٰ کے سوا اپنا آقا بنائے۔ اس میں دین و دنیا کی سرخروئی ہے

حقائق و عبر

مجرم کون

حال ہی میں مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال کی طرف سے ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق تحریک مفاہمت پیش کی گئی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ ایک ذمہ دار جماعت سے متمسک ہونے کے بعد انفرادی طور پر اس قسم کی تحریک پیش کرنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔ یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ سے ہی فراخدل واقع ہوا ہے اور خاص طور پر ہندوستان کی گذشتہ ربع صدی کے سیاسی مدّ و جزر میں تو اس نے اس قدر فراخ حوصلگی اور رواداری دکھائی کہ برادرانِ وطن کی خاطر اپنے آپ کو بھی بھول گیا لیکن علی الرغم اس کے برادرانِ وطن کی طرف سے جو سلوک روا رکھا گیا وہ ان کی خود غرضی۔ تنگدلی اور متعصبانہ بے راہ روی کا بیّن ثبوت ہے۔ اب تلخ تجربات کے بعد جب مسلمان اپنے آپ میں آرہا ہے تو اس کو خود فراموشی کی افیون سے مدہوش کرنے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلی جارہی ہیں۔

مسٹر فضل الحق نے تحریک مفاہمت شاید یہ سمجھ کر پیش کی ہے کہ تلاطم زمانہ کے تھپیڑوں نے شاید ہندو کی ذہنیت کو کسی حد تک بدل دیا ہو۔ چنانچہ ان کی تحریک مفاہمت پر ہندو اخبارات کی طرف سے جو طرح طرح کے تبصرے کئے گئے ہیں وہ سب ان کی مخصوص ہندوانہ ذہنیت کی غمازی کر رہے ہیں۔ مثلاً ٹریبون نے اپنے ۷ دسمبر کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے۔

"گذشتہ دو سال سے ہمیشہ مفاہمت کی پیشکش کانگرس کی طرف سے کی جاتی رہی ہے اور ارباب بصیرت پر واضح ہے کہ مفاہمت میں ناکامیابی کی ذمہ داری کانگرس پر عائد نہیں کیجاتی اس لئے اب مفاہمت کی کوشش مسلم لیگ کی طرف سے کی جانی چاہئے" (ٹربیون ۷ دسمبر)

یعنی ان کے نزدیک ہندو ہمیشہ مصالحت کے لئے تیار رہتے ہیں اور مسلمان اس قسم کی کوششوں کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ بہت اچھا! اب سنئے کہ ہندو مصالحت کے لئے کس درجہ بے تاب اور شرائط صلح میں کیسا وسیع انقلاب واقع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں :-

صلح صرف ایک ہی صورت میں ہوسکتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہونے کا دعویٰ ترک کردیں متحدہ قومیت اور جمہوریت (اکثریت کی حکومت) کے خلاف اپنے ادعا کو باطل تصور کریں ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ قومیتیں سمجھنے کا خیال چھوڑ دیں اور تسلیم کرلیں کہ جمہوری طرزِ حکومت (ہندو اکثریت کی حکومت) قابل قبول ہے۔ مسٹر جناح ان کے دست راست اور پیروکار اپنے اس دعویٰ کو کہ علیحدہ قومیت کا نظریہ جداگانہ انتخاب کا طبعی اور منطقی نتیجہ ہے غلط مان لیں۔ (ٹریبون، دسمبر صفحہ)

لیجئے! اب اگر اس کے بعد بھی مسلمان اپنی ضد پر اڑے رہے اور صلح کے لئے ہاتھ نہ بڑھائے تو فرمائیے کہ اس میں ہندو بیچارے کا کیا قصور۔

کفر اور اسلام میں "مفاہمت" کی یہ کوئی نئی شرط نہیں۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے قرآن کریم میں ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۱۲۰ ۰۲

یہود اور نصاریٰ آپ سے کبھی راضی نہیں ہوسکتے جب تک آپ اپنے دعاوی کو چھوڑ کر ان کے نظریات حیات کی اتباع نہ کریں۔

مسلمان اپنی ضد پر کیوں قائم ہے۔ وہ اپنے ان دعاوی سے دستکش کیوں نہیں ہوسکتا۔ اس کے متعلق بار بار لکھا اور کہا جاچکا ہے لیکن جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے خود ٹریبون کی اسی اشاعت کے ، صفحہ پر ہمیں اس کا جواب مل جاتا ہے۔ لکھنؤ کے ڈاکٹر مکرجی نے بھی مفاہمت کی ایک اسکیم پچھلے دنوں پیش کی تھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ روزنامہ رقمطراز ہے۔

"بدقسمتی سے ہندوستان کے مسائل متنازعہ فیہ کی بنا زبان نسل اور مذہب پر نہیں ہے بلکہ مسٹر جناح کی قیادت میں تمام مسلم لیگی متحدہ قومیت کے سراسر خلاف ہیں۔ وہ ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ ان کے اور دوسرے ہندوستانیوں کے اختلافات تمام کے تمام بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اندریں حالات مصالحت ناممکن ہے۔ ہم حیران ہیں کہ جب حقیقت یہ ہے تو ڈاکٹر مکرجی کی سکیم اختلافات کی اس وسیع خلیج کو کس طرح پاٹ سکتی ہے۔

(ٹریبون، دسمبر صفحہ)

ملاحظہ فرمالیا آپ نے کہ خود ان حضرات کو بھی اعتراف ہے کہ مسلمانوں کے یہ مطالبات اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وضعی اور فرعی نہیں اور ایک ہندو ہی کیا اب تو انگریز کو بھی تسلیم ہے کہ مسلمانوں کے یہ مطالبات بنیادی ہیں چنانچہ حال ہی میں مسٹر ایمری نے لندن میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"مسلمانوں کے خطرات کو مٹانے کے لئے نئی صورت پیدا کرنی پڑے گی یعنی صوبجات کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دئے جائیں اور نئے سرے سے صوبجات کی تقسیم کیجائے۔ اور حتی الوسع صوبجات کو مرکز سے آزاد رکھا جائے۔ (اسٹیٹمین ۲۲ نومبر صفحہ)

نیز جناب وائسرائے نے بھی ۱۶ نومبر کو کلکتہ میں "ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس" کے سالانہ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے اسی حقیقت کا اعتراف کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"ہندوستان کے حالات۔ موجودہ صورت کا پس منظر اور عناصر ترکیبی دولت متحدہ سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ سراسر حماقت ہوگی اگر ہندوستان کے آئینی مسائل کو حل کرنے میں یہاں کی بڑی بڑی جماعتوں اور سیاسی پارٹیوں کے زاویۂ نگاہ۔ ان کی تہذیب و ثقافت۔ ان کی قومی روایات اور ان کے مزاجوں کے اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے خاص حالات کے مطابق نئی صورت پیدا نہ کیجائے۔ (اسٹیٹمین ۱۷ دسمبر صفحہ)

ہندو بھی اقرار کرتا ہے اور انگریز بھی مانتا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات حقیقت پر مبنی ہیں لیکن اگر آج آسمان کے نیچے کسی کو اس حقیقت سے انکار ہے تو وہ خدا کے فضل سے نیشلسٹ مسلمان ہے۔

بوٹا بوٹا۔ پتہ پتہ حال ہمارا جانے ہے!
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

آغوشِ امن

"تقدس مآب" (His Holiness) جناب پوپ نے یورپ کے خداوندان اقتدار سے درخواست کی ہے کہ خدا کے لئے ایام کرسمس میں تو آگ اور خون کی اس امن سوز بارش کو بند کر دو۔ امن و سلامتی کے پیغام بر، خدا کے پہلوٹھے بیٹے کی خاطر مسیحیت سوز سرگرمیاں ترک کر دو

تم سب کے سب حضرت یسوع مسیحؑ کو خدا کا اکلوتا بیٹا، شافع اور منجی مانتے ہو۔ وہی مقدس گڈریا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ زمین ظلم سے بھر گئی، خون کے دریا بہہ گئے اور تمہیں ذرا ۔۔۔ بھی احساس نہیں۔ تمہیں انسانیت کا واسطہ۔ اپنی تہذیب کا صدقہ۔ خدا کا خوف کرو "میلاد مسیح" کے ان مقدس اور بابرکت ایام میں تو حرب و ضرب کے "دیو بے محابا" اور بہیمیت کے "فیل بے زنجیر" کو باندھ لو۔ میری درخواست کو شرف پذیرائی بخشو۔ حاشا وکلا میں تمہیں یہ کب کہنے لگا کہ جنگ بالکل بند کر دو۔ اور نہ ہی یہ کہہ رہا ہوں کہ ہمیشہ بھر کے لئے "بیکار" بیٹھے رہو صرف چند دنوں کے لئے التوا کی درخواست کرتا ہوں۔

جناب پوپ نے بکمال لجاجت و رقت اپنی یہ خواہش ظاہر کی لیکن دنیا نے دیکھ لیا کہ ان کی درخواست صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ بھلا جس تہذیب کی بنیاد ہی مادیت کے طوفان بدتمیزی پر ہو وہ خدا کے "واسطہ" کو کیا جانے جس تمدن کی حالت یہ ہو کہ ؎

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

وہ مقدس گڈریے کی آواز کو کیا پہچانے۔

پوپ کی درخواست امن ٹھکرا دی گئی اور دنیا میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی لیکن اس درخواست و آرزو میں ارباب فکر و نظر کے لئے غور و تدبر کی دعوت عام بھی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ انسانیت کو عین جنگ کے دوران میں بھی کچھ وقت کے لئے التوائے جنگ کی تمنا ہوتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا نظام بھی موجود ہے جس میں انسانیت کی اس تمنا کی بھی رعایت رکھی گئی ہے۔ دنیا کے مفکر دم بخود ہیں۔ ان کے پاس اس قسم کا کوئی نظام موجود نہیں اور نہ ہی تاریخ عالم کی کوئی قوم ایسا نظام پیش کر سکتی ہے۔ اگر اس قسم کا نظام پیش کیا گیا ہے تو اس نظام حیات کی طرف سے جسے یورپ نے سنگدلانہ کہا اور جس نظام کے متبعین کو بربریت، سبعیت اور امن سوزی کا طعنہ دیا گیا۔

یہ نظام حیات اسلام ہے جس کی اساس اخوت بشری اور احترام آدمیت پر قائم ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ظلم کی مدافعت اور مظلوم کی محافظت کے لئے اسلام نے جنگ کو روا رکھا ہے لیکن اسلامی آئین جنگ میں ہمیں یہ حکم بھی ملتا ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے قابل احترام ہیں ان میں جنگ کرنا

حرام ہے اور جو اس حرمت کا انکار کرے وہ کافر ہے۔

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ (توبہ) (سال کے بارہ مہینوں میں سے، چار مہینے واجب الاحترام ہیں

نازک سے نازک صورتِ حالات میں بھی ان کی حرمت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ مہینے مختلف موسموں میں چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ لیکن خواہ کسی موسم میں بھی آئیں ان میں جنگ حرام کر دی گئی۔ اور اس امر کی بھی صراحت کر دی کہ تم ان مہینوں میں اپنی مرضی سے ردّ و بدل نہیں کر سکتے۔

اِنَّمَا النَّسِیٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ (توبہ) (حرمت والے مہینوں میں ردّ و بدل کرنا کفر ہے)

غور فرمائیے جو مذہب جنگ کے دوران میں بھی اس قسم کی "امن پسندی" کی تلقین کر رہا ہو۔ اس کے سوا اور کون نظام ہے جو انسانیت کے لئے اپنے آغوش میں پیام امن رکھتا ہو یقین مانیے۔ دنیا کو سب جگہ سے تھک تھکا کر بالآخر اس نظام میں پناہ ڈھونڈنی ہوگی۔ اس وقت ہر آستانے سے ٹھکرایا ہوا انسان خدا کی بارگاہ میں آئے گا اور بچشم نم پکارے گا کہ اے مولیٰ!

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں

اسلام کے نادان دوست

ماہ نومبر کے جامعہ میں "اسلام ہیگل کی نظر میں" کے عنوان سے۔ ہیگل کے خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس مضمون کا تعارف کراتے ہوئے جامعہ نے لکھا ہے کہ ہیگل نے باوجود اپنی عیسائی تربیت اور مذہبی اثر کے اسلام کی ان شاندار خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ جو نظام اسلام نے نسل انسانی کو ارتقائی مدارج کے طے کرنے کے سلسلہ میں کی ہیں۔ نیز اسلام کو اخلاقی اور سماجی لحاظ سے ایک زبردست انقلاب کہا ہے۔

لیکن ہم نے جب ہیگل کے اس مضمون کو دیکھا تو اس میں چند ایسے گمراہ کن تصورات ملے جنھیں علی حالہٖ شائع کرنا کسی صورت میں بھی اسلام کی خدمت نہیں کہلا سکتا۔ مثلاً وہ کہتا ہے:۔

(۱) اسلام میں فرد صرف ایک جذبہ اور اسی جذبہ کا حامل ہوتا ہے۔ اگر ظلم کرے گا تو بے انتہا ظلم

بہادر ہوگا تو بے انتہا بہادر، چالاک ہوگا تو چالاکی کا مجسمہ ــــــ"

(۲) جس تیزی سے عربوں کی فتوحات ہوئیں اسی تیزی سے علوم و فنون بھی اپنے معراج کمال پر پہنچ گئے۔ پہلے تو ہم ان فاتحین کو علوم و فنون کی ہر چیز تباہ و برباد کرتے ہوئے پاتے ہیں"

(۳) خلفاء کی سلطنت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی کیونکہ جس کی بنا عالمگیر ہو اس میں کوئی چیز استقامت پذیر نہیں ہوتی"

(۴) اسلام نے حواسی عشرت کے ابتدائی مدارج تک کی جو اجازت دی تھی اور جسے مومن کے لئے جنت کے انعام کی صورت میں ظاہر کیا گیا تھا اب اس میں شدت بڑھ گئی۔ اور مسلمان خراب سے خراب برائیوں میں پڑ گئے اور نہایت کریہہ جذبات ان پر متولی ہو گئے"

وہ کون سا مسلمان ہے جو ہیگل کے ان خیالات کو عین اسلام تصور کرے گا لیکن ہمیں ارباب جامعہ کی اس "اسلام دوستی" پر افسوس آتا ہے کہ وہ اس قسم کے اسلام کش خیالات کی اشاعت و توسیع میں مغربی ملحدین کے ایجنٹ بن جاتے ہیں ان کی طرف سے اس قسم کے اکثر تراجم شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں نہایت ہی خوشنما الفاظ میں اسلام کے خلاف زہر پھیلایا جاتا ہے۔ ہم مخالفین کے خیالات کو ناقابل برداشت نہیں سمجھتے۔ اور نہ ہی یہ کہتے ہیں کہ ایسے خیالات کو شائع نہ کیا جائے۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں اور اس سے پیشتر کئی بار کہہ چکے ہیں وہ فقط اتنا ہے کہ اس قسم کے مضامین کی اشاعت کے وقت ارباب جامعہ کو چاہیئے کہ جو باتیں اسلامی تعلیم کے خلاف ہوں ان کی ساتھ ہی ساتھ تردید کیجائے۔

افسوس ہے کہ ارباب جامعہ اس طرف توجہ نہیں فرماتے۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ صحیح اسلامی تعلیم سے ناآشنا ہیں یا خدانخواستہ دانستہ ایسا کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک پیدا کر دئے جائیں۔

مندرجہ بالا خیالات کو اسلام کی روشنی میں دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ یہ کس طرح اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہیں۔ مثلاً

(۱) اسلام جو کہ اقتصاد و میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے اور جس کے متبعین کو امت وسط کے نام سے پکارا

گیا ہے ۔ اس قسم کی افراط و تفریط کو کیسے تبدیل کر سکتے ہیں اور پھر کیا ایک سچا مسلمان "بے انتہا ظالم" اور چالاک کا مجسمہ بھی ہو سکتا ہے؟ یہ عجیب تعریف ہے ۔

(۲) دوسرا اعتراض بھی فضول ہے ۔ کیونکہ تاریخ اس قسم کی کوئی شہادت پیش نہیں کر سکتی کہ قرن اوّل میں علوم و فنون کی مخالفت کی گئی ہو ۔ غور فرمائیے جو مذہب ہر وقت غور و تدبر کی دعوت دیتا ہو ۔ جو علم کو شرف انسانیت قرار دیتا ہو اور جس کے نزدیک تسخیر فطرت آدمی کا اولین فریضہ ہو اس کے متبعین علوم و فنون کی کیسے مخالفت کر سکتے ہیں ۔

(۳) یہ نظریہ کہ جو نظام عالمگیر اصول کی بنا پر قائم کیا گیا ہو استقامت پذیر نہیں ہے سراسر جاہلانہ ہے اور ہمیں ہیگل سے کوئی شکایت بھی نہیں کیونکہ تصورات کی دنیا میں گم ہونے والا انسان جو خدا کو اپنی عقل کی دائرہ میں قید کرنا چاہتا ہے اسے کیا معلوم کہ زمان و مکاں کی حدود سے بلند و بالا خدا کا معین کردہ نظام کس طرح حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہوتا ہے جب فطرت کے عالمگیر قوانین ازل سے قائم ہیں تو کسی عالمگیر نظام کے متعلق یہ کہنا کہ وہ استقامت پذیر نہیں کس قدر جہالت ہے ۔

(۴) اسلام جنّت کے تصور کو حواسی عشرت کے اثر سے آزاد رکھتا ہے وہ اسے "عیشۃ راضیۃ" کے نام سے موسوم کرتا ہے ۔ اور مسلمان کی زندگی، موت اور اس کی تمام تر خواہشات کو اللہ کی مرضی کے تابع کرنا چاہتا ہے ۔ اس لئے مسلمانوں کے زوال کو جنّت کے عشرت پسندانہ تصورات پر محمول کرنا کوتاہ نظری ہے عشرت پسندی ملوکیت کا لازمہ ہے اور مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح اسی سبب سے زوال پذیر ہوئے ۔

بہر حال دونوں صورتوں میں یہ چیز افسوسناک ہے ۔ ہم ان کی خدمت میں ایک بار پھر گذارش کریں گے کہ وہ ایسے مضامین شائع کرتے وقت ایسے ایسے گمراہ کن خیالات کی تردید ضرور کر دیا کریں ۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو پھر اس قسم کے مضامین شائع ہی نہ کیا کریں ۔

چو کفر از کعبہ برخیزد ....

دانش حاضرہ کا برا ہو کہ اس نے بعض مسلمانوں کے اذہان پر اس قدر تسلط جما لیا ہے کہ وہ اسلام کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں سراسر غیر اسلامی خیالات کا حاصل ہوتا ہے چنانچہ اس کا زندہ ثبوت یادش بخیر جناب سر سلطان احمد صاحب

کے اس تازہ خطبہ سے مل سکتا ہے۔ جو انہوں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر دیا ہے۔ اس خطبہ میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق انہوں نے فرمایا۔

اگر سچ پوچھو تو اصل بات تو یوں ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ثقافتی اختلافات کو خواہ مخواہ غیر معمولی اہمیت دی جا رہی ہے اور سمجھا جا رہا ہے کہ ان دونوں میں مفاہمت ناممکن ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس وقت ہندوستان میں مختلف ثقافتی قوتیں سرگرم عمل ہیں اور ان میں یورپین تہذیب نو کو بھی بڑا دخل ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ چونکہ ہندوستان یا بیرون ہند کے مسلمانوں کی زندگی پر ان کے مذہب کا ایک گہرا اثر ہے اس لئے ان کے فنون لطیفہ شاعری اور معاشرت کے تمام رنگ ڈھنگ عربی اور ایرانی خطوط پر ہی مشکل میں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مسلمان از روئے ثقافت ہندی روایات ہندی خیالات اور ہندی فنون لطیفہ سے مکمل طور پر اجنبی ہے۔ اور نہ ہی ارتقائے متحدہ قومیت کے یہ معنی ہیں کہ اس سے دونوں قوموں کے مذاہب معدوم ہو جائیں گے۔ آخر جب مختلف طبائع رکھنے کے باوجود افراد ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور ہم آہنگی سے کام کر سکتے ہیں تو دو فرقے مختلف و متمیز مذاہب رکھنے کے باوجود تعاون اور ہم آہنگی سے کیوں کام کر سکیں ایہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اپنے پرائیویٹ معاملات کو پبلک زندگی سے علیحدہ کیوں نہ رکھیں؟ اور اسی طرح ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مذہب کو جو ایک انسان کا اپنے خدا یا معبودوں کے ساتھ ایک پرائیویٹ تعلق ہی تو ہے اپنی شہری اور سیاسی زندگی سے الگ کیوں نہ رہنے دیں؟ اگر ذرا عام فہمی کی نظر سے دیکھا جائے تو درحقیقت ہندو مسلم اختلافات کا مسئلہ ایسا نہیں کہ ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہو اور اس کا کوئی حل نہ مل سکتا ہو۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ نسلی اور سیاسی اعتبار سے ہم سب ہندوستانی ہیں۔ ایک ہی فضا میں سانس لیتے اور ایک ہی ملک میں سکونت رکھتے ہیں ہم سب کے سب ایک ہی قابل فخر قدیم تہذیب کے وارث ہیں اور ہم ذاتی طور پر خواہ کیسے ہی خیالات رکھیں یا مقصد حیات متعین کریں ہمارے مقدرات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ہم میں اختلافات ضرور ہیں لیکن جن چیزوں پر ہماری زندگی کی بنیاد قائم ہیں وہ تو ایک ہی ہیں۔"

سن لیا آپ یہ ہیں وہ ارشادات عالیہ جو ملت اسلامیہ ہندیہ کی واحد یونیورسٹی علی گڈھ کے پلیٹ فارم سے ان فرزندان اسلام کو تکمیل علم کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھنے والے ہیں وصایا کے طور پر سنائے گئے ہیں تاکہ وہ موت حیات کی کشمکش میں ان افکار عالیہ سے سپر کا کام لیں خطبے کے ان ارشادات کو چشم بصیرت سے دیکھئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا واقعی یہ خیالات اس قابل ہیں کہ ایک مسلم یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے ایک مسلمان کی زبان سے ان فرزندانِ توحید کو سنائے جائیں جن سے ملت اسلامیہ کی بڑی سے بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ اور جو مستقبل قریب میں اسلامی سیاست کے ناخدا بننے والے ہیں ہمیں سر سلطان احمد سے کوئی خاص گلہ نہیں۔ اس لئے کہ ان کی جس قدر مذہبی بصیرت ہے۔ وہ اس کے مطابق بات کر سکتے ہیں۔ انہیں تو ہم صرف اتنا مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ جس چیز کو سمجھتے نہیں اس کے متعلق خاموشی۔ بہر حال لب کشائی سے بہتر ہوتی ہے لیکن ہمیں افسوس ہے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ارباب بست وکشاد پر کہ انہوں نے "مسلم یونیورسٹی" کے پلیٹ فارم کو اس قسم کے غیر اسلامی خیالات و تصورات کے پروپیگنڈا کا محطۂ نشر الصوت بنا رکھا ہے۔ خدا حافظ ایسی "مسلم یونیورسٹی" کا جہاں طالب علموں کو اس قسم کے سبق پڑھائے جاتے ہیں۔

اعتراف حقیقت

احمد آباد میں مونسپل کمیٹی کے انتخابات کے سلسلہ میں "انڈیپنڈنٹ انڈیا" نے اظہار حقیقت کے طور پر لکھا ہے۔

> احمد آباد کے مونسپل انتخابات میں کانگریس کی نمایاں کامیابی کو تمام کانگرسی اخبارات نے فتح عظیم تصور کرتے ہوئے اس پر خوب حاشیہ آرائی کی ہے لیکن مسرت و شادمانی کے مظاہروں میں وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ مسلم لیگ نے برابر ہی نہیں بلکہ ان سے کہیں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ضروری ہے کہ اس حقیقت کے بعد کانگریسی رہنما خواب غفلت سے بیدار ہو کر صورت حال کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ مسلمانوں پر کانگریس کا اثر پریشہ کے برابر بھی نہیں رہا۔ غور کیجئے احمد آباد جیسے مکمل کانگرسی ذہنیت کے شہر میں کسی ایک مسلم سیٹ پر بھی کانگریس کا قبضہ نہیں ہو سکا۔ کیا یہ اس امر کا زندہ ثبوت نہیں کہ عامۃ المسلمین پر مسلم لیگ کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ لیکن ان تلخ حقائق کے تجربہ کے بعد بھی کانگرس

مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ یقیناً یہ ایک نہایت واضح حقیقت ہے کانگریس کے انکار کی متمردانہ ہٹ دھرمی ہے ۔ اور کانگریس کی یہی روش ملک کی موجودہ سیاسی پستی کی سب سے زیادہ ذمہ دار ہے ۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ احمد آباد کے میونسپل انتخابات کا یہ سبق کانگرسی رہنماؤں کی چشم حقیقت شناس کو وا کر دے اور وہ اس تجربہ کے بعد فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے متعلق صحیح زاویۂ نگاہ اختیار کریں ۔

(انڈیپنڈنٹ انڈیا ۱۵ دسمبر ۱۹۴۰ء)

لیکن کانگرس تو ان حقائق سے جب سبق لے کہ اسے ہندوستان کی آزادی مقصود ہو ۔ ان کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ انگریزوں کے زیر سایہ ہندو راج قائم کیا جائے ۔ اور اگر مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مان لیا جائے تو ہندو راج کا یہ خواب پریشاں ہو جاتا ہے ۔

اب فرمائیے؟ راشٹرپتی جناب ابو الکلام صاحب آزاد کے متعلق جب مسٹر جناح نے کہا کہ وہ کانگریس کی بساطِ سیاست کے محض ایک نمائشی مہرہ ہیں تو یہ حقیقت نیشنلسٹ حلقوں کو ایسی تلخ گذری جیسے نور کی کرن چمگادڑ کی آنکھ میں کھٹک پیدا کر دیتی ہے لیکن گذشتہ ۶ ماہ کے واقعات نے ایک ایک کرکے بتایا کہ مسٹر جناح کا تبصرہ کس قدر واقعیت پر مبنی تھا ۔ وہ تو مسٹر جناح نے کہا تھا ۔ اب سنئے کہ کانگرس کے اندرونی نظم و نسق کے ایک واقفِ حال کا جناب راشٹرپتی کی پوزیشن کے متعلق کیا خیال ہے ۔ مسٹر سبھاش چندر بوس اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں ۔

دو کانگرس کا مغل اعظم دن بدن ایک مسخرے کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اپنے دولت کدہ بلیا گنج واقع سرکلر روڈ میں بیٹھے ہوئے گاہے بگاہے معتوبین کے خلاف تادیبی گولہ اندازی کرکے سارے بنگال پر حکومت کر سکتا ہے ۔ اسے اس سے کیا غرض کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے بجائے خود آئین کانگریس کی حدود سے باہر ہے ۔ اور نہ ہی اسے ان نتائج و عواقب کا خیال ہے کہ اس قسم کی تعزیری کارروائیوں سے تو وہ تھوڑے دنوں میں تمام پبلک کو کانگریس سے نکال باہر کرے گا ۔ اسے دیکھکر مجھے مغلوں کے دور انحطاط کے وہ

شہنشاہ یاد آجاتے ہیں جو شاہی جلال و جبروت کے ماحول میں گھرے رہنے کی وجہ سے اس حقیقت سے قطعاً بے خبر ہے کہ ان کی صف حکومت الٹی جا چکی ہے اور ان کی مملکت ان کے دست تصرف سے کبھی کی نکل گئی ہے۔ میں حیران ہوں کہ ہمارے اس شہنشاہ کو کون حقیقت حال سے مطلع کرکے ہوش میں لائے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے تمام اختیارات مہاتما گاندھی کے سپرد کر دیئے ہیں۔ اور اکثر ارکان کمیٹی جیل جا چکے ہیں۔ اب مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ اختیار کہاں رہا لیکن پھر بھی وہ بزعم خویش اسی خیال پر جمے ہوئے ہیں کہ وہ شہنشاہ اعظم فرانس کی طرح "حکومت مجسم ہیں۔ آج اگر کسی فرد واحد کو کانگریس کے متعلق کچھ بولنے کا حق ہے تو وہ مہاتما گاندھی ہیں نہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد۔" (ہندوستان ٹائمز ۲۵ دسمبر)

مسٹر جناح نے نوراشٹرپتی صاحب کو ایک نمائشی لڑکا ہی کہا تھا۔ مسٹر نوس تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ اب دیکھئے نیشنلسٹ حضرات کیا فرماتے ہیں لیکن نیشنلسٹوں سے پوچھنے کی بجائے خود جناب آزاد سے پوچھیے کہ کانگرس میں گاندھی جی کی پوزیشن کے متعلق مسٹر نوس نے جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی غلطی یا مبالغہ ہے؟

بلند ہتے ہیں سرو کو آزاد اور وہ پابگل
کیسا وہ آزادی جہاں یہ حال ہو آزاد کا

نقد و نظر

غلامان اسلام

یہ کتاب مولوی سعید احمد صاحب۔ ایم۔ اے۔ فاضل دیوبند مدیر رسالہ البرہان نے لکھی ہے اور ندوۃ المصنفین دہلی نے اسکو شائع کیا ہے۔

ضخامت ۳۰۲ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۲۶ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت غیر مجلد للعہ۔ مجلد صہ

غلامان اسلام دراصل مولوی سعید احمد صاحب کی کتاب "الرّقّ فی الاسلام" کی دوسری جلد ہے اس میں ابتدائی عہد اسلام کے اُن آزاد شدہ غلاموں کے حالات ہیں جو اپنے علم و تقوے کی بدولت امت میں مقبول اور نامور ہوئے۔ انمیں سے "۱۵" وہ ہیں جو عہد صحابہ میں تھے۔ اور "۲۷" تابعین میں سے پھر تبع تابعین میں سے "۲۶" اور اسکے بعد کے زمانہ کے چند بزرگان کرام۔

انمیں سے اکثر وہ لوگ ہیں جو ائمہ علوم شمار کئے گئے اور آجتک انکے نامونکی سند مانی جاتی ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے جس کوشش کے ساتھ یہ حالات جمع کئے ہیں اور جس خوش اسلوبی سے لکھا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انکے ہاتھ میں ایک اچھا قلم ہے اور انکی عبارت صاف اور بیان واضح ہے۔

جس مطلب کے اظہار کے لئے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے (یعنے اسلام نے غلامونکو مراتب عالیہ پر پہونچایا) اسکے لئے یہ بھی مناسب تھا کہ ان علماء کی جماعت کے ساتھ ان مسلمان سلاطین اور ملوک کے بھی تذکرے ہوتے جو غلاموں میں سے ہوئے۔ ممکن ہے کہ آئندہ وہ ایسا کریں۔

ندوۃ المصنفین ابھی نو عمر ادارہ ہے۔ اور مولوی سعید احمد صاحب نے اس دو سال کی قلیل مدت میں تین کتابیں لکھ ڈالی ہیں اور امید ہے کہ ابھی بہت کتابیں لکھینگے کیونکہ جوان ہیں اور حوصلہ مند۔ اسلئے مناسب معلوم ہوا کہ اس کتاب میں چند باتیں جو قابل اعتراض ہیں انکو ظاہر کردوں تاکہ آئندہ کے لئے خیال رکھیں۔ میرا مقصد محض نکتہ چینی نہیں بلکہ علمی خیر خواہی ہے۔

(۱) پوری کتاب مطالعہ کرنے کے بعد یہ چیز ظاہر ہوجاتی ہے کہ حالات مورخانہ نہیں بلکہ عقیدتمندانہ انداز میں

لکھے گئے ہیں اور دو چیزیں خاص طور پر اسکو نمایاں کرتی ہیں۔ ایک عبارت۔ مثلاً کسی کے حال میں لکھتے ہیں

وہ غلام ہونے کے باوجود علم و کمال کے آسمان پر مہر جہانتاب بنکر چمکے "

دوسرے کے ذکر میں کہتے ہیں۔

"انکا آستانہ افادہ و درس بڑے بڑے احرار و نجبا کے لئے بوسہ گاہ عقیدت ہوگیا"

اس قسم کا شاعرانہ انداز سخن مدح سرائی ہے جو تاریخ نگاری میں عیب سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ اس کتاب میں جا بجا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بات اسقدر گرفت کے قابل نہیں ہے جسقدر دوسری یعنے جن بزرگوں کے حالات لکھے گئے ہیں انکے اوصاف و محامد میں تو قلم جلی رکھا گیا ہے مگر انکے اوپر جو جرحیں وارد ہیں وہ یا تو قطعاً چھوڑ دی گئی ہیں یا لکھی بھی گئی ہیں تو خفی قلم سے۔ حالانکہ یہ لوگ ائمہ روایت ہیں۔ انکے اوپر جرح و تعدیل جو کچھ ہوئی ہے اسکو بجنسہ قائم رکھنا چاہیئے کیونکہ وہ علمی امانت ہے۔ مثلاً ابن جریج کے متعلق جنہوں نے اسلام میں سب سے پہلی تفسیر لکھی اور جو اسرائیلیات کے بطل کبیر مانے گئے ہیں ائمہ جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ روایتیں وضع کرتے تھے[1]۔ خود تذکرۃ الحفاظ میں جس سے مصنف نے انکے حالات لئے ہیں امام شافعیؒ کا قول موجود ہے کہ ابن جریج نے ۹۰ عورتوں سے متعہ کیا۔ لیکن اس کتاب میں یہ باتیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

امام محمد شاگرد امام ابوحنیفہؒ کے حالات میں بھی انکے خلاف جو رائیں اسوقت ائمہ نے ظاہر کی تھیں اور جن میں امام مالک کا بھی یہ قول ہے کہ "علماء عراق کو بمنزلہ اہل کتاب کے سمجھو نہ انکی تصدیق کرو نہ تکذیب"[2] نہیں لکھی گئی۔ اسی طرح حضرت عکرمہ اور مجاہد وغیرہ کے متعلق جو جرحیں ہیں وہ درج نہیں کی گئیں۔ اور یہ امر تاریخی دیانت کے منافی ہے۔ بعض جگہ واقعات کو غلط شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً صفحہ ۱۳۰ میں لکھتے ہیں۔

"ایک مرتبہ اعمش بیمار تھے۔ امام ابوحنیفہ انکی عیادت کو تشریف لے گئے۔ دیر تک بیٹھے رہے چلنے لگے تو فرمایا کہ میں اتنی دیر تک آپکے پاس بیٹھا رہا اس سے تو آپ پر بڑا بار ہوا ہوگا۔ اعمش بولے کہ آپ اپنے گھر میں ہوتے ہیں تو بھی میرے لئے بھاری ہوتے ہیں"

---

[1] فجر الاسلام صفحہ ۲۴۲ [2] مختصر جامع بیان العلم صفحہ ۱۹۶

اس عبارت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ (اسمیں امام اعظم کی جلالت علم کی طرف تلمیح ہے) حالانکہ حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے جو اہل علم سے مخفی نہیں۔ بات یہ تھی کہ اعمش محدثین کے امام تھے جو اصحاب رائے مثلاً ابراہیم نخعی یا ابوحنیفہ وغیرہ کو غلط راستہ پر سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے انسے ملنا بلکہ انکی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی معذرت کے لئے امام ابوحنیفہ نے جو ایک جماعت کے ساتھ انکی عیادت کو آگئے تھے۔ مندرجہ بالا فقرہ کہا۔ امام اعمش نے انکے جواب میں جو بات کہی اس سے بیزاری کا اظہار مقصود تھا نہ کہ "امام اعظم کی جلالت علم کی طرف تلمیح"، کیونکہ وہ اس جلالت علم کے قائل ہی نہ تھے۔ چنانچہ باہر آکر امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اعمش کی نہ کبھی نماز ہوئی نہ روزہ۔ یہ اس بنا پر کہ اعمش حضرت علی کی حدیث المارمن ٢ لما، کے قائل تھے۔ [1]

(٢) اس کتاب میں بعض بعض بزرگوں کے کرامات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً ایوب سختیانی کے حالات میں لکھتے ہیں کہ انکا قافلہ جب مکہ کے راستہ میں سخت پیاسا ہوا تو انہوں نے زمین پر ایک دائرہ بنا دیا جہاں سے پانی اُبلنے لگا۔ پھر جب سارا قافلہ سیراب ہو گیا تو اس جگہ پر ہاتھ رکھدیا جس سے پانی بند ہو گیا۔ حضرت ذوالنون مصری کے متعلق لکھتے ہیں کہ۔

"حضرت ذوالنون ایک مرتبہ کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ انکا ہمسفر ایک بہت بڑا سوداگر بھی تھا جو کئی قسم کے قیمتی جواہرات اور کثیر مقدار میں سونا اپنے ساتھ لیجارہا تھا۔ اتفاق سے سوداگر کے یہ تمام جواہرات چوری چلے گئے۔ کشتی میں حضرت ذوالنون کے مانند کوئی دوسرا غریب نہ تھا۔ اسلئے کشتی کے لوگوں نے انہیں کو مجرم قرار دیا اور انکو اذیت پہونچانے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت ذوالنون نے یہ دیکھکر آسمان کی جانب دونوں ہاتھ اٹھائے اور التجا کی کہ ایخدا جو حقیقت حال ہے تو اسے خوب جانتا ہے۔ انکا یہ کہنا تھا کہ کئی مچھلیوں نے دریا سے سر نکالا۔ انمیں سے ہر ایک کے منہ میں ایک ایک موتی تھا۔ حضرت ذوالنون نے یہ موتی ان مچھلیوں سے لے لئے اور سوداگر کے حوالہ کر دئے۔"

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ١٩٦

یہ وجہ تسمیہ تذکرۃ الاولیاء سے نقل کی گئی ہے۔ اولیاء کے تذکرے خواہ عربی میں ہوں یا فارسی یا اردو میں اور خواہ کسی نے لکھے ہوں "کتب مناقب ہیں" صورت یہ تھی کہ جو شخص بزرگ مسلم ہو جاتا اسکے اوصاف وکرامات مجلسوں اور محفلوں میں عقیدت مندی کے ساتھ بیان کئے جاتے۔ متصوفین کے نزدیک چونکہ اصولاً منقبت میں گرفت نہیں ہے۔ اسلئے مجال سخن بہت وسیع تھی۔ اور جو کچھ جسکی زبان پر آتا تھا کہہ ڈالتا تھا۔ لوگ اس سے انکار کو سعادتمندی کے خلاف سمجھتے تھے۔ انمیں بیانات نے مقبولیت اور شہرت اختیار کری اور تذکروں میں مندرج ہو گئے۔

آج بھی اس جماعت کے جو بقایا ہیں وہ اسی "طرح" میں غزلیں کہتے ہیں۔ اور اپنے پیرو نکی ایسی ایسی کرامتیں بیان کرتے ہیں جنکو سنکر عقل ہنستی ہے علم روتا ہے اور دین لرزتا ہے۔ اسلئے ان تذکروں سے اخذ کرنے میں مؤرخ کو احتیاط لازم ہے۔

(۳) بعض بعض روایتیں اس میں ایسی درج ہو گئی ہیں جنکو دیکھکر کوفت ہوتی ہے۔ مثلاً امام حسن بصری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ انکو دودھ پلا دیتی تھیں۔ اور انمیں جو غیر معمولی فصاحت پائی جاتی تھی وہ اسی مقدس شیر خوارگی کے طفیل میں تھی"

سوال یہ ہے کہ حسن بصری کی ولادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے گیارہ بارہ سال بعد ہوئی حضرت ام سلمہ ازواج مطہرات نبوی میں سے ہیں۔ پھر یہ دودھ کہانسے آیا جو انکو پلا دیتی تھیں۔ مولوی سعید احمد صاحب اگر کہیں کہ یہ ممکن ہے کہ بچے نے جسوقت منہ لگایا ہو اسوقت رحمت الہی سے دودھ کا فیضان ہو گیا ہو تو میں کہونگا کہ اس سے ہزار گنا زیادہ یہ ممکن ہے کہ راوی کذاب ہو اور جھوٹ بول رہا ہو۔ اللہ نے انسان کو تنقیدی عقل عطا فرمائی ہے اور اسکے استعمال کو کہیں حرام نہیں بتایا ہے پھر ایسی روایت جو حرم نبوی کے احترام کو مجروح کرتی ہو کیوں نہ جانچی گئی۔

اسی طرح امام سعید بن جبیر اور حجاج کی گفتگو جو پورے چار صفحوں میں نقل کی گئی ہے کسی ایسے شخص کی تراشی ہوئی ہے جو حجاج کی حالت سے قطعاً ناآشنا تھا۔ حجاج باوجود سفاک اور خونریز ہونے کے عہد بنی اُمیہ کا سب سے زیادہ مدبر۔ عالم قرآن اور عالی دماغ وزیر تسلیم کیا گیا ہے۔ اسکے دربار میں نہ جھوٹ کا

گزرتا نہ اس قسم کی فضول بکواس کا جو اس روایت میں ہے۔ سعید بن جبیر اسکے نزدیک باغی قرار پا چکے تھے اور ایسے لوگوں کا فیصلہ وہاں صرف دو لفظوں میں ہوتا تھا۔ میں واقف ہوں کہ یہ روایت کتب تاریخ میں ہے لیکن میرے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ بات جو کتابوں میں ہو صحیح بھی ہو۔

(۴) ان ائمہ کے متعلق جا بجا علم قرآن اور علم فقہ کی مہارت کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے۔ مناسب ہوتا کہ شروع میں ایک مقدمہ میں تصریح کر دی جاتی کہ ان علوم سے مراد کیا ہے۔ یہ حضرات جہانتک تاریخ سے معلوم ہوتا ہے "حاملین علوم" تھے۔ یعنے انکا علم صرف روایت تھا اور انھوں نے سلف کے علم کو خلف تک پہونچایا۔ خود انکا اپنا کارنامہ اسکے سوا کچھ نہیں ہے۔ الفاظ کے معانی اور آیات کے مطالب میں دس دس اختلافی اقوال، ناسخ و منسوخ اور شان نزول وغیرہ کی روایات اور قصص اور اسرائیلیات یہی انکا قرآنی ذخیرہ تھا جو بعد میں آکر سرتاسر مجروح ہوگیا۔ کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان۔ ابو صالح مصری۔ محمد بن سائب کلبی۔ محمد بن مروان۔ بشر بن عمار اور عوفی وغیرہ جو انکی روایات کے وارث ہوئے جانچنے سے ضعیف بلکہ وضاع نکلے[1]۔ چنانچہ آخر میں بعض ائمہ حدیث نے ان روایات کی صحت سے صاف انکار کر دیا۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا کہ تفسیری روایات کی کوئی اصلیت نہیں[2]۔ اور امام احمد وہ ہیں جنپر حدیث کی امامت منتہی ہوتی ہے۔ انسے بڑھکر انکا کون واقف کار ہو سکتا تھا۔ خود انکے ایک رفیق ابو زرعہ کو جنکا ذکر اس کتاب میں بھی ہے تفسیر میں ایک لاکھ چالیس ہزار حدیثیں یاد تھیں[3]۔ مگر وہ سب انکے نزدیک بے بنیاد تھیں کیونکہ انکے راوی ضعیف تھے۔

(۵) یہ تمام غلامان اور علمائے اسلام جنکا ذکر اس کتاب میں ہے ایک مخصوص جماعت یعنے رواۃ میں سے ہیں انکے تراجم کا ایک ہی رنگ ہے۔ مثلاً تحصیل علم۔ استادوں کے نام۔ شاگردوں کی فہرست۔ زہد و عبادت ہم عصر علماء کے انکے بارے میں اقوال وغیرہ وغیرہ۔ یہی چند عنوانات ہیں جنکی ہر ایک کے تذکرہ میں خانہ پری کی گئی ہے۔ اس طبقاتی یکسانیت کی تلخی کو مٹانے کے لئے ضرورت تھی کہ انکے انفرادی حالات زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کی کوشش کی جاتی جس سے تنوع اور دلچسپی پیدا ہوتی۔ کتب اسماء الرجال اور محدثین کے تذکروں میں بالعموم یہی ثقالت پائی جاتی ہے کیونکہ وہ جرح و تعدیل کے امور عام کو پیش نظر رکھتے تھے اور خاص حالات کو جن سے شخصیت نمایاں ہوتی ہے۔ اپنے مقصد سے غیر متعلق سمجھکر نظر انداز کر دیتے تھے۔ امام نووی یا ذہبی کے تذکرے

---

[1] مرآۃ التفسیر ص ۲۰ سے ص ۲۸ تک۔ [2] تذکرۃ الموضوعات ص۸۲۔ [3] توجیہ النظر ص۱۴۸

ایسے ہی ہیں جو محض علمی ضرورت پر ہی دیکھنے پڑتے ہیں ۔ بخلاف انکے بعض حضرات نے اس رمز کو سمجھ لیا اور اشخاص کی خصوصیت کا خیال رکھا جن میں سے ابن خلکان اور امام سبکی صاحب طبقات الشافعیہ ممتاز ہیں ۔ انکی کتابوں میں پڑھنے والونکو ہر شخص کے تذکرہ میں امید رہتی ہے کہ کچھ نئی باتیں ملینگی جس سے انکی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے مولوی صاحب کو بھی مزید تذکرے دیکھنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ انفرادی حالات اور واقعات سے اشخاص کے تراجم کو زیادہ دلچسپ بنا سکتے ۔ مثلاً امام محمد کے حالات میں اُن بحثوں کا لکھنا نہایت ضروری تھا جو امام شافعی کے ساتھ ہوئیں اور جو دلکش ہونے کے ساتھ مفید فقہی نکات پر مشتمل ہیں ۔ اسی طرح سفیان بن عیینہ ۔ شعبۃ بن الحجاج اور خاصکر عبداللہ بن مبارک کے حالات میں بہت سے اہم واقعات کا اضافہ ہو سکتا تھا مجھے امید ہے کہ طبع ثانی میں اس کا ضرور لحاظ رکھا جائیگا۔

ان امور کے علاوہ چھوٹی چھوٹی متعدد غلطیاں بھی اس کتاب میں اصلاح طلب ہیں جنکو غیر اہم سمجھکر میں نے چھوڑ دیا ہے۔

اسلم جیراجپوری

تپ دق کی طرح "پائیریا" کے تین درجے ہیں

اوّل ۔ دانتوں کی عام تکالیف اور مسوڑھوں سے خون آنا۔

دوم :۔ مسوڑھوں میں پیپ پڑنا

سوم :۔ معدہ ماؤف ہوکر دُنیا کے ۸۰ فیصدی مہلک امراض کی پیدائش

کچھ بھی ہو اگر آپ کو واقعی ۲ دو باتوں کا احساس ہے :۔ یعنی

بحالت صحت ! حفاظت

بحالت مرض ! نجات

تب اپنے پتہ سے مطلع کرنے میں تامل نہ کریں

حائی جیا انڈسٹریز (انڈیا) انبالہ چھاؤنی

حیات محمد عبدہٗ

یہ رسالہ چارلس ایڈمس Charles Adams کی کتاب **Islam and modernism in Egypt** کے بعض ابواب کا ترجمہ ہے جو مفتی محمد عبدہٗ کی سرگذشت حیات سے متعلق ہیں۔ مولوی محمد مظہر الدین صاحب نے اس ترجمہ سے مفتی محمد عبدہٗ مرحوم کی شخصیت سے اُردو اہل زبان کو پہلی بار روشناس کیا ہے۔ مفتی مرحوم کی سیرت پر عربی میں بہت لکھا جا چکا ہے اور اتحاد عالم اسلام کی تحریک (PAN ISLAMISM) سے متعلق ہونے کی وجہ سے یورپ میں ان کی کافی شہرت ہے۔ لیکن اُردو زبان میں ان کے متعلق اس سے پہلے کوئی مواد موجود نہیں تھا۔ وہ اتحاد عالم اسلام کے سچے علمبردار تھے۔ اور اپنے شفیق استاد سید جمال الدین افغانی مرحوم کی رفاقت میں اس سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔ تمام عالم اسلام ان دونوں کا مرہون منت ہے۔ کیونکہ اس وقت عالم اسلام میں بیداری کے جسقدر آثار نظر آرہے ہیں یہ بیشتر انہی کی مساعی جمیلہ کے برگ و بار ہیں۔ امت مسلمہ کو ان کے افکار و عقائد کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے اور انہیں مشترکہ رہنماؤں کی حیثیت دینی چاہیئے کیونکہ انہوں نے تمام عالم اسلام کو اپنا وطن سمجھا اور تمام مسلمانوں کو از سر نو رشتۂ اخوت میں منسلک کرنا چاہا اس لئے انکی سیرت اور مقاصد کے متعلق جس قدر بھی تحقیق کی جائے کم ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہندی مسلمانوں نے اس فرض سے مجرمانہ تغافل برتا حالانکہ انہیں اس باب میں پیش پیش ہونا چاہیئے تھا کہ ان کی نجات اتحاد عالم اسلام سے وابستہ ہے۔

اگرچہ اس ترجمہ سے ہمیں مفتی محمد عبدہٗ مرحوم کی زندگی اور اُن کے مشن (MISSION) کے متعلق کافی معلومات ملتی ہیں۔ لیکن اتحاد عالم اسلام" پر جو اُن کی زندگی کا واحد مقصد تھا بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ ساری خرابی اس لئے ہے کہ اصل کتاب کا مقصد صرف تاریخی ہے اس لئے اس کتاب سے مفتی محمد عبدہٗ مرحوم کی "میکانکی" (MECHANICAL) زندگی تو نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے لیکن وہ چنگاری جو اس خاکستر کے نیچے دبی ہوئی تھی اور جس نے ان میں اس طرح کی سیمابیت پیدا کر رکھی تھی اوجھل رہتی ہے۔ بلا شبہ مفتی مرحوم کی سیرت کے متعلق ایک کتاب

کی اہم ضرورت تھی لیکن اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ذاتی تحقیق کرنی چاہیئے تھی۔ اسلامی نظریۂ اتحاد کو پس منظر (BACK GROUND) بناکر مفتیٔ مرحوم کے مقاصدِ زندگی کی تفصیل بیان کرنی ضروری تھی اور ایک انگریز مصنّف کے خیالات کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے بھی تنقیدی مقالات پیش کرنے چاہیئے تھے۔ عربی زبان میں مفتی مرحوم کے متعلق کافی سے زیادہ مواد موجود ہے اور انکی تحریک اصلاح کے متعلق مفصل معلومات مل سکتی ہیں۔ اس لئے اگر اس مواد سے فائدہ اٹھایا جاتا تو یہ کوشش زیادہ مفید ہو جاتی۔ کیا اچھا ہو کہ کوئی اولوالعزم نوجوان اس سلسلہ میں تحقیقات شروع کردے اور ان علمبردارانِ اتحادِ عالم اسلام کے متعلق ایک جامع کتاب تصنیف کردے تاکہ اُن کے افکار و نظریات کی روشنی میں انکی شروع کردہ تحریک پھر زندہ ہو۔ بہرحال مترجم اور ناشرین کی اتنی کوشش بھی حوصلہ افزائی کی مستحق ہے۔

کتاب ۳۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت۔ طباعت۔ ٹائیٹل دیدہ زیب۔ قیمت فی نسخہ ۱۲؍ ملنے کا پتہ:۔ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاجپورہ لاہور۔

اسلامی معاشرت

نقشِ ثانی

(از جناب پرویز صاحب)

دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے۔ لیکن افادی حیثیت سے بڑی بڑی تصانیف پر بھاری ہے۔ مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اس کا ماحول کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کی عادات و اخلاق کا خاکہ۔ اس کے رہنے سہنے کا ڈھنگ اس کے تمدن و معاشرت کے خط و خال اس کی تعلیم و تہذیب۔ اس کے دنیاوی معاملات اپنوں اور بیگانوں سے اس کے تعلقات غرضیکہ اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر انداز و اسلوب قرآنی آئینہ میں کیسا ہونا چاہیئے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں یہ سب کچھ آگیا ہے۔ اور اس قدر سادہ اور دلنشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہر بات سیدھی دل میں اُتر جاتی ہے اور لطف یہ کہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر چیز قرآن کریم کی چھوٹی چھوٹی آیات میں بیان کی گئی ہے۔ بچوں کے لئے یہ پمفلٹ بہت ہی مفید ہے۔ اسلامی مدارس میں بطور نصاب کے داخل کر لیا جائے تو طلباء کے قلب و دماغ کی تعمیر صحیح اسلامی بنیادوں پر ہو جائے **قیمت** ۴ر محصول ار

ادارۂ طلوعِ اسلام

دھلی

معاملہ کی ضروری باتیں

(۱) طلوعِ اسلام ہر انگریزی مہینے کی یکم کو التزاماً شائع ہو جاتا ہے اور نہایت احتیاط سے حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے۔

(۲) رسالہ موصول نہ ہونے کی اطلاع زیادہ سے زیادہ دس تاریخ تک دیجئے۔ ورنہ بعد میں شاید پرچہ موجود نہ ہو۔ اور اگر موجود بھی ہوگا تو بلا قیمت نہ مل سکے گا۔

(۳) تبدیلی پتہ کی اطلاع ۲۵ تاریخ سے پہلے پہلے آجانی چاہیے۔

(۴) جس ماہ کی خریداری کا چندہ ختم ہوتا ہے اس مہینہ کے پرچہ کے اندر ایک اطلاع (جوابی) کارڈ رکھ دیا جاتا ہے جواب ایک ہفتہ کے اندر اندر آجانا چاہیئے۔

(۵) چندہ سالانہ پانچ روپیہ معہ محصول ڈاک ہے۔ اور قیمت فی پرچہ ۸/۔ چندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجنے میں خریدار کو کفایت اور منتظمین کو سہولت رہتی ہے۔

(۶) ہر رقم موصولہ (خواہ وہ کسی ذریعہ سے موصول ہو) کی ایک رسید بھیجی جاتی ہے۔

(۷) وی۔ پی طلب کرنے کے بعد اسے وصول نہ کرنا ادارہ کو بلا جرم سزا دینے کے مرادف ہے۔

(۸) منی آرڈر کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھئے نیز رقم کی تفصیل بھی درج فرمایئے۔

(۹) آپ اپنا تعارف نمبر خریداری کے ذریعہ سے ہی کرا سکتے ہیں اس لئے اس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ ہمیں بے حد دقت اور آپ کو ناواجب شکایت ہوگی۔

(۱۰) نمبر خریداری یاد نہیں رہا کرتا۔ کہیں نوٹ کر چھوڑیئے۔

(۱۱) "طلوعِ اسلام" کوئی تجارتی ادارہ نہیں۔ بلکہ ملّت اسلامیہ کے اجتماعی مقاصد کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے اس لئے اس سے اشتراکِ عمل اور معاونت ایک ملی خدمت ہے۔

(۱۲) خوش معاملگی کی استواری کی بنیاد یہ ہے کہ فریقین ہر وقت خدا کو اپنے درمیان رکھیں۔ وَاللّٰہُ المُستعان

(۱۳) نمونے کے پرچے کے لئے ۴/۔ کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔

ناظم

ادارہ طلوعِ اسلام دہلی

Printed at the Jayyed Press, Delhi.
Published by Z. A. K. from Tulue Islam Office Delhi.